عشاق کے قافلے

4

شاہ عبداللطیف بھٹائی

(1752-1689)

شاہ محمد مری

جملہ حقوق بحقِ سنگت اکیڈمی محفوظ ہیں

ضابطہ:

نام کتاب	.....	شاہ عبداللطیف بھٹائی
مصنف	.....	شاہ محمد مری
موضوع	.....	سوانح
پہلی اشاعت	.....	2013
دوسری اشاعت	.....	2017
تعداد	.....	1000
قیمت	.....	200 روپے
پبلشر	.....	سنگت اکیڈمی
فون نمبر	.....	03003829300

ISBN 978-969-673-015-6

ملنے کا پتہ:

سنگت اکیڈمی

206، مری لیب، فاطمہ جناح روڈ، کوئٹہ۔

فون:+92-81-2843358

email: books@sangatacademy.net

اُن بڑے انسانوں کے نام.....

جو بڑے انسانوں کو
دیوتا بنانے کی مزاحمت کرتے ہیں!

قتل گاہوں سے چُن کر ہمارے علَم
اور نکلیں گے عشاق کے قافلے

فہرست

ثقافتی دنیا کا ایک بہت بڑا کنفیوژن — مقدمہ — 10

سماجی معاشرتی پس منظر — 33

- شاہ اور اس کے جوگی — 35
- سب سے بڑی زیارت گاہ: بلوچستان — 38
- سفر کی خصوصیات — 41
- اولمپک مشعل لطیف کے ہاتھ — 44

شاہ، سندھی کلاسیک کا بیتا — 48

- سوہنڑیں مہیر — 51
- سورٹھ رائے ڈیاچ — 52
- لیلاں چنیسر — 54
- نوری جام تماچی — 55
- مومل رانڑو — 56

- شارک کے شکاری — 58
- سسی پنہوں — 59
- عمر ماروی — 64

میوز، میوزک — 66

شاہ لطیف، اپنے سماج کا تجزیہ نگار — 70

شاہ لطیف، فطرت کا دوست — 71

شاہ لطیف کا سماجی ہدف — 80

عشق آسماں، نمود اول..... — 86

عورتیں انقلاب کی سپاہ ہیں! — 94

بارش.....ایک سماجی تبدیلی — 101

بلوچ، شاہ کا محورِ امید — 106

بھٹائی

پیرل زبیرانی

شاعرانی سر گلاآن سندھ ملک ءِ شپ چراغ
بھِٹّ سُنّیں ریک بھُٹّاں سوز سرُت باغ باغ
سَسُّئیَ ءَ پنُّو ءَ گوں داں ا بد زندہ گُتہ
سُنہڑیّ ءُ ہم میہار ءَ زندگی داتہ شُتہ
ہوتُ جَتّانُ بلوچاں ہم بلوچستان نام
کُرتہ زندہ قیامتا داں گوں وتی پاکیں کلام
مارُوئی او عُمّرا ہم مارُوآں گوں زندگی
مُومل ورانڑو ء ناماہم بداتہ روشنی
بات شاہ ءِ پاک ناما او کلاما جی و جی
دیتۀ لیلاوَ چنیسرآ نہیاچے زندگی

جام دریائی جمارے دیتۀ بیتہ جام جام
مورو ڑو ءِ کار کرداراں کتہ آں نوک نام
دانکہ شاہ ءِ شعر لوظنت و کلام انت عالما
سندھ گوں سندھی زبانازندگ ئَن ہم دائما
ساز زندہ سوز زندہ ہم گشندہ زندگ انت
دانکہ شاہ ءِ شعر و کافی و کلاماں زندگ انت
شہ بھٹائی ءِ کتاب ءِ پَنُّ پَن داں زندگ انت
عشق زندہ شوق زندہ عاشقاں ہم زندگ انت
ہم ہمے بھٹائی کن نگا ہے پیرلؔ ءِ گُنڈا بیا
سیاہ گُگیں اے شفانی شف چراغے بی و بیا

مقدمہ

ثقافتی دنیا کا ایک بہت بڑا کنفیوژن

ہم آج بھی اُس اولین بشر کی طرح ہیں جس نے پہلے پہل چیزوں کو متحرک و متبدل دیکھا تو خوف کی حد تک حیران ہوا تھا۔ ظاہر ہے کہ وہ اس وقت تک فکری طور پر اس قابل نہ تھا کہ تبدیلی کے داخلی اسباب کی طرف توجہ کر سکتا۔ چنانچہ اسے ان متحرک چیزوں کی قوتِ متحرکہ داخلی کے بجائے خارجی لگی، مافوق الفطرت۔ بادل کی گرج، زلزلوں کے جھٹکے اور بارش کا برسنا عام انسانی تفہیم اور قوت سے تو باہر تھے ناں! ۔لہٰذا اِن مظاہر کی مادی تشریح کو ناممکن دیکھ کر اُن کی پرستش شروع کر دی گئی۔ یہیں پہ تو دیوی دیوتاؤں کی ایجاد ہوئی ..... یہ بارش کا دیوتا ہے، یہ آگ کی دیوی ہے، یہ زمین کا یہ سورج کا، یہ اولاد کا، یہ شکار کا۔ ایسا دیوتا جو ڈائنوسار سے بھی قوی تر ہو، اور گرج سے طاقت ور ہو اور بجلی سے سبک رفتار۔

یہاں کچھ لوگ زندگی کی آنکھوں سے آنکھیں ملانے سے کترانے ڈرنے لگے۔ اُس سے گتھم ہونے کے مقابلے میں زندگی کو پشت دکھانا زیادہ آسان تھا۔ محنت و جرأت کی کمی شکست خوردگی کی طرف لے گئی۔ مقابلہ کی بات خارج ہوئی، تو پھر دنیا کی مسرتوں، دولتوں ہی کو برا بھلا کہنا شروع کر دیا۔ دنیا اور زندگی دونوں کو جھوٹا قرار دیا گیا۔ بس، ''دیوتا سچا ہے، دیوتا ہی محبت و عبادت کے لائق ہے، پھر عقیدہ بن جاتا ہے کہ جو لوگ دنیا کے سکھ سمیٹنے میں لگ جاتے ہیں اور ہر وقت دھن اور دولت جمع کرنے میں لگ جاتے ہیں، اُن کو دیوتا کی مہربانی کی دولت کبھی نہیں ملتی اور نہ اُن کی مکتی اور نجات ہو سکتی ہے''۔ یہ الگ بات ہے کہ بعد میں دیوتا، اس کے دربار، اس کے لنگر اور اس کے

عرس کا سارا انحصار دولت مندوں کے چندوں عطیوں پر ہو جاتا ہے۔

اور جب دیوتا اور دیوی وجود میں آ گئے تو پھر ان میں انسانی عادتیں گھڑ لی گئیں۔ کس چیز سے دیوتا خوش ہوتا ہے اور کیا بات اسے ناراض کرتی ہے؟۔ دیوتا کو راضی رکھنے کی خاص رسومات بنتی گئیں۔ اِن رسومات میں بہت زیادہ سرگرم انسان کو اعلیٰ اور اشرف جانا گیا اور یوں اِن دیویوں دیوتاؤں کو رام کرنے والے خصوصی افراد وجود میں آئے، اِن دیوتاؤں کے محبوب و چہیتے لوگ جو کسی بھی حاجت مند کی حاجت سفارش کر کے پوری کروا سکتے تھے۔ یعنی دیویوں دیوتاؤں کے ساتھ ساتھ اُن کے اِن برگزیدہ و پسندیدہ لوگوں کی بھی پرستش و عبادت ہونے لگی۔..... یوں مجاور، مخدوم، سجادہ نشین، خلیفہ، گدی نشین، بھگت، سوامی وغیرہ کے القابات ایجاد ہوئے۔ انہی کو خوش کرنے میں دیوتا کی خوشی گھڑ لی گئی..... ۔اور انہی برگزیدگان نے آگے جا کر حکمرانوں کا روپ دھارنا تھا۔ پھر یہی دولت و طاقت کے ساتھ آگے آئے، اور دیوی دیوتا محض اُن کی کمپنی اور کارپوریٹ بن کر رہ گئے۔

مگر بہ یک وقت کچھ ایسے لوگ بھی تھے جنہوں نے ان مظاہر کی منطقی تشریح کرنا چاہا۔ اُن سے خوف زدہ ہونے کے بجائے اُن میں دلچسپی لی، انہیں کھوجا کھودا، اور ان کی اصل کو تلاش کر کے دنیا کو بتا دیا۔ ادھر ہی سے فلسفہ کی سائنس پنپنا شروع ہوئی۔

دونوں اطراف ترقیاں ہوتی رہیں۔ اُدھر مزید اساطیر عبادات و مندر میں بدلتے گئے، حیات بعد از مرگ کا نظریہ بنا اور اِدھر مزید ایجادات سامنے آنے لگیں، تقلید کی مخالفت ہوئی۔ کسی نے کائنات میں زمین کی مرکزی حیثیت کو للکارا، کسی نے سورج کو خدا قرار دینے کے بجائے اُسے گیسوں کا مجموعہ قرار دیا۔ اس ''جرم'' پہ کسی کو زندہ جلایا گیا اور کسی کو زہر پینے کی سزا دی گئی۔

یہ کشمکش ہر جگہ چلتی رہی۔ مگر سب سے منظّم و ریکارڈ شدہ طور پر یونان میں۔ روم میں تو طویل و تباہ کن آمریت نے ہر بحث اور ہر کشمکش کو بند کر دیا اور یہ جھگڑا یورپ سے باہر چلا گیا۔ بوعلی سینا نے پہلا حملہ ہی بائبل پر کیا یہ کہہ کر کہ اسے تو جاہلوں کے لیے قصے کہانیوں سے بھر دیا گیا ہے۔ چرچ اور پادری کی حکمرانی پر پہلا حملہ میکاولی نے کیا..... اور پھر رینیساں ہوا جس میں دلیل و

سائنس نے ڈوگما، راسخیت اور جنونیت پر جوابی حملہ کیا اور بنی نوع انسان کے لیے سوچ کی آزادی حاصل کی۔ چرچ سے ہٹ کر آزادانہ طور پر سچ کی تلاش کرنے کی جنگ کے کمانڈروں میں سے کچھ کے نام یہ تھے: دانتے، پٹرارچ، ڈاونچی، اراسمس، لوتھر، ویچو، کوپرنیکس، گلیلیو، نیوٹن، بیکن اور جیرارڈ برونو۔ (آخر الذکر کو اس کے خیالات پہ پادریوں نے زندہ جلا دیا)۔ ایسی کشمکش سے عبارت ہے انسانی تاریخ۔ اور سوچ و فکر کے یہی دونوں دھارے چلتے آئے۔ آج انسانوں کی وسیع ترین اکثریت انہی دو مکتب ہائے فکر میں سے ایک سے وابستہ ہے۔ سائنس و ٹکنالوجی کی ساری ترقی کو اِن دونوں نے خوب خوب استعمال کیا، بالادست نے زیادہ اور کمزور نے ذرا کم۔

ایک تیسرا فریق ایسا وجود میں آ گیا جسے ''یوٹوپیائی'' کہتے ہیں۔ یہ گروہ تھا تو عقیدہ پرست، مگر وہ انسان اور انسانی زندگی پر زیادہ توجہ مرکوز رکھتا تھا۔ بنی آدم کی خوش حالی و خوشی کی تمنا کرتا ہوا۔ یہ گروہ بادشاہت کو پسند نہیں کرتا تھا، جاگیرداریت کو اچھا نہ سمجھتا تھا۔ دنیا میں بالعموم اور مشرق میں بالخصوص ایک تماشا یہ کیا گیا ہے کہ یہاں بڑے بڑے مصلحوں، انقلابیوں اور خیر و آشتی کے پیامبر انسانوں کو پیر و مرشد، سینٹ اور مہاتما بنا کر ان کی پوجا شروع کرائی جاتی ہے۔ اور دیکھتے دیکھتے موجود و مروج کا باغی، اُسی موجود و مروج کے پیشواؤں میں بھرتی کیا جاتا ہے۔ یوں اُس کے کارناموں، تعلیمات اور بشر دوستی کے رواں دواں جوہر کو عقیدہ و پرستش کے چوغے میں لپیٹ کر وار دیا جاتا ہے۔ اُس کے نام کے ترانے، نعرے، ورد، جھنڈے، جلوس ڈھول، رقص، نشہ اور رسومات اُس کی علامت بن کر رہ جاتے ہیں۔

آئیڈیلزم چیزوں کو تصور کرتا ہے، روحوں کے وجود کو فرض کرتا ہے، ہر چیز کو تصور میں کامل تصور کرتا ہے۔ مگر جس بھی چیز کو فرض کرتا ہے ثبوت پیش نہیں کرتا۔ سائنسی وضاحت نہیں دیتا۔ لوگوں نے اُن تقدیر پرست بزرگوں کی پوجا شروع کر دی۔

شاہ عبداللطیف بھٹائی گزشتہ چار صدیوں سے ہمارے پورے منطقے کا ایسا ہی مقبول ترین ولی رہا ہے۔ میں اُسے فلاسفر، دانش ور اور شاعر تو بعد میں کہوں گا جب میں اپنی بات کر رہا ہوں گا۔ اب تو دیکھتے ہیں کہ لوگوں کی نظر میں شاہ کا مقام کیا ہے۔ لوگوں کی نظر میں وہ معجزات بھرا ولی ہے۔

اور ہمارے لوگ خود کیا ہیں؟۔ ہمارے عوام الناس شعور کی کس سطح پر ہیں؟ لوگ تو تقدیر پرستی کے پروردہ ہیں۔ لوگ عجوبہ اور وقوعہ پرست ہیں۔ لوگ جو بت شکن بننے میں ایک گہرا تھرل محسوس کرتے ہیں اور جب سازگار حالات ہوں اور لمپن لوگوں کا مجمع اکٹھا ہو تو گلی بازار میں بُت شکنیاں کرتے پھرنے کی شوبازیاں کرتے پھرتے ہیں مگر ساری زندگی اپنے دلوں میں تعصّبات و چھوٹے پن کی بت سازی ہی کرتے جاتے ہیں اور اسی بت پرستی کے پیہم عمل میں مرجاتے ہیں۔

حتیٰ کہ سماج میں کچھ لوگ تو اس کے نام سے، اس کے جھنڈوں بینروں سے انسان کو قتل کرنے کے جتھے بنا ڈالتے ہیں۔ وہ اِن جتھوں کو انہی بڑے انسانوں سے منسوب کر کے اس کی تعلیمات کو خون آلود کرتے چلے جاتے ہیں۔ اس طرح اُن کے لوٹ مار حتیٰ کہ قتل و غارت کو جواز کا ایک موٹا پردہ مل جاتا ہے۔

پھر وقت آیا کہ ہمارے شاہ سائیں کو پنڈتوں، سجادہ نشینوں نے ایک ایسے درویش کے روپ میں پیش کیا، جو ایک طنبورہ گود میں لیے تصورِ جاناں کیے بیٹھا رہتا ہے۔ ہر لمحہ یادِ یار میں مشغول ہے۔ دنیا و مافیا سے بے خبر ہے۔ گرد و پیش سے اُسے کچھ خاص سروکار نہیں۔ ضیا الحق والے زمانے میں بس یہ فرق آیا کہ اس مشہورِ زمانہ پورٹریٹ میں اُس کے ہاتھ سے طنبورہ چھین کر، وہاں تسبیح دے دی گئی۔ یادِ یار کو یادِ الٰہی میں بدل دیا گیا۔ باقی بیانیہ وہی رہا۔

بلاشبہ، تقدیر پرستی (آئیڈیلزم) دیگر دانش وروں کی طرح شاہ کا بھی اوڑھنا بچھونا رہی۔ شاہ کے آئیڈیلزم کی وجوہات مادی معاشی سماجی تھیں کہ ایک پسماندہ اور خود کفیل دیہی معاشرے میں ایکٹو عملی مزاحمت کی صورت موجود نہ تھی اور شاعری و موسیقی کا ملاپ معروض کی ضرورت تھی۔ مگر شاہ نے عوامی معاملات کو جس بھرپور اور موثر انداز میں چھیڑا۔ اُس کا ثانی پہلے موجود نہ تھا۔ اپنے کلاسیک کی زمین پر مضبوطی سے پاؤں جمائے شاہ نے اپنے عوام سے مکمل وابستگی رکھی۔ کبھی فلسفیانہ اور کبھی سیدھا سیدھا انداز اپناتے ہوئے۔

شاہ نے اہم ترین عصری موضوعات کا سامنا کیا۔ وہ بادشاہ، فیوڈل، ملا اور پیر سے فاصلہ رکھ کر اپنی فکر کی آبیاری کرتا رہا۔ اور گو کہ بعد کے ہر دربار و سرکار نے اُس کے افکار کو کانٹے دار

لگام پہنانے کی کوشش کی مگر شاہ کو عام اور غریب عوام کے دلوں سے نکالا نہ جا سکا۔

ذرا سا غور کیا جائے تو حیرت ہوتی ہے کہ اِن بڑے بڑے انسانوں کی تعلیمات تو ساری کی ساری انسان دوستی کی تھیں۔ وہ عقیدہ بن ہی نہیں سکتی تھیں۔ مگر اس کے باوجود پیروں اور جاگیرداروں نے مزے مزے سے ''Sufi Shrine Cult''(1) کھڑا کر دیا۔ اور ہمارے ان بہت بڑے انسانوں کو نرینہ اولاد عطا کرنے، پرائی عورت کو رام کرنے، ڈاکہ میں برکت ڈالنے، فلم کو کامیاب بنانے، اور مخالف کو زیر کرنے کے کام پر لگا دیا۔ کہیں یہ راسخ مذہب بنا، کہیں ذرا مبہم سا عقیدہ اور کہیں محض ایک فوک مکتبہ فکر ہی رہا۔

پاکستان میں بالخصوص پچھلے بیس پچیس برسوں میں ابھر آنے والی مڈل، اور اپر مڈل کلاس واضح اکثریت میں سرکار کے ہاتھ میں ہے اور مطلق رائٹسٹ ہے۔ یہ مطلق رائٹسٹ اب جج، سیکریٹری، ڈی جی اور جنرل کے عہدوں تک پہنچ چکا ہے۔ وہ اپنے دکھوں دردوں کو اپنے مخصوص طبقاتی پس منظر میں ایک رومانوی اور شارٹ کٹ انداز میں فریم کرتی ہے اور ان کے رومانوی انداز کے حل چاہتی ہے۔

اُدھر سوویت یونین کے خاتمے کے بعد پاکستان میں ہر حکومت کو یہ مسئلہ پیش ہوا کہ پاکستان کی قیادت میں ابھرنے، منظّم ہونے اور پھر بہت طاقت ور ہونے والے دہشت گرد گروہوں کو کس طرح قابو کیا جائے۔ تب بالائی طبقات کے کچھ دانشوروں کو سوجھا کہ گویا بنیاد پرستی کے خلاف لڑنے کے لیے ایک نیا محاذ کھڑا کرنے کی ضرورت ہے، ایک مذہبی روحانی محاذ..... جسے وہ ''مِسٹسزم'' یا ''صوفی گیری'' کہتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں ہمارے خطے کے بشر دوست فلاسفروں، مصلحوں اور بزرگوں کی تعلیمات کو Cult اور عقیدہ بنایا جائے، اُس عقیدے کو صوفی گیری کا نام دیا جائے اور اُس عقیدے کو دوسرے عقیدے یعنی وہابی عقیدے سے لڑوا دیا جائے۔ اس تصور کو این جی اوز نے فوراً اچک لیا اور پھر ڈونروں والے مغربی ممالک کے تھنک ٹینکس نے اس کی منظوری دے دی۔

اچھے لوگ انہیں سمجھاتے رہے کہ انہیں اس سے کوئی فائدہ نہ ہوگا، اور نہ کسی مذہبی

عقیدے کے ہاتھوں، دوسرے کسی بھی عقیدے کو شکست دلا کر کوئی جمہوری یا سائنسی سماج کبھی بھی نہیں قائم کیا جا سکتا۔ عقائد کو تو اوپری حاکم طبقہ ہی استعمال کرتا ہے اپنے اقتدار کو دوام دینے۔ پیرو پنڈت ہمیشہ سرکار کے فائدے کے لیے استعمال کیے جاتے ہیں۔ اور جس وقت کوئی عقیدہ شاہ و حاکم کے استعمال کے قابل نہیں رہتا حاکم اُسے پرے پھینک دیتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں، جس وقت کوئی عقیدہ عوام (رعایا) میں مقبول نہیں رہتا حاکم کے لیے بے کار بن جاتا ہے۔

پاگلو، بدھ مت سب سے امن پسند مذہب ہے مگر اِس کی وجہ سے دنیا میں امن ہوا کیا؟ چین اور ویت نام کی لڑائی یاد ہے؟ کمبوڈیا کی خانہ جنگی یاد ہے؟۔ برما میں اسی امن پسند مذہب کا مسلمانوں پر جنگ یاد ہے؟

تقدیر پرستی تو ایک عقیدہ ہے جو عوام الناس کے دلوں میں گہرائی سے پیوست ہے۔ ہر دوسری تقدیر پرستی پہلی قسم والی تقدیر پرستی جیسی ہوتی ہے۔ قسم و نوع خواہ کوئی بھی ہو، پرچم و رنگ و نعرے کچھ بھی ہوں، ''تقدیر پرستی'' ایک ایسا راسخ عقیدہ ہے جہاں شک کرنے کی آزادی نہیں ہوتی، سوال پوچھنا تو درکنار سوال سوچنے کی آزادی بھی کسی مادی معاشی یا جانی نقصان کی سزا لاتی ہے۔ حالاں کہ سوال کرنا، بحث کرنا تو انسانی شناخت ہے۔

ایک اور بات ذہن نشین کرنے کی ہے۔ وہ یہ کہ ہر خاموش رضامندی ''تقدیر پرستی'' کی حوصلہ افزائی کرتی ہے اور ہر اختلاف اُسے اگلی بار دوبار سوچنے پر مجبور کرتا ہے۔

راسخیت کو صرف ایک بات سے شکست دی جا سکتی ہے اور وہ ہے، سائنسی سوچ۔ اور یہ سارے رائٹسٹ عقیدہ ساز، اِن انسان دوست فلاسفروں کی تعلیمات کو عقیدہ بنانے میں عرصے سے کامیاب چلے آ رہے ہیں اور اپنا اقتدار قائم و برقرار رکھے ہوئے ہیں۔ ریڈیو ٹی وی پہ اُن ناپاک فیوڈل لیڈروں کے پیام کے نام پر ہمارے بہت بڑے اور مقبولِ عام مفکروں اور روشن فکر عوامی انقلابی شاعروں کو راہب، نیم مجنون، پیر، ولی یا صوفی سمجھنے پر لگا دیا گیا۔ شاہ لطیف تو کیا، اُس کے پیش رو شاہ عنایت تک کی مزاحمت والی روایت کے بجائے جھوک میں اس کے دربار میں انہی پیری فقیری والی روزی کمانے والے لوگوں کو جمع کر دیا جاتا ہے۔ اور اُن کی سماج مخالف کارستانیوں کو

''صوفی ازم'' کا نام دیا جاتا ہے۔ بھنگ، چرس، اور اغلام بازی تو عام انسان کی توہین ہے، شاہ کا پاک دربار تو پھر فلسفیوں کی تفکر گاہ ہے۔

تو اب نئی بات کیا ہے؟۔ صوفی ازم اور وہابی ازم کو حکومت باہم ٹکراتی ہے تو اُس سے نئی کیا چیز نکلے گی؟۔ صرف اور صرف خوف، غنودگی کو جگہ دے گی، بس۔ (ہمارے معاشرے میں دوڑ ہی اس بات پہ ہے کہ کون زیادہ خوف پیدا کر سکتا ہے اور کون زیادہ غنودگی)۔ اور خوف، غنودگی جیسے نتائج ہی دیتا ہے۔

خیر، سندھ میں تو یہ بہت بڑی ستم ظریفی کافی عرصہ سے موجود ہے کہ وہاں سارے بڑے انسانوں کے واضح خدوخال اور صورت ہونے کے باوجود ان کے گرد ایک بہت گہرا ہالہ بنا دیا گیا ہے۔ ایسا کہ ہم اس میں انسانی اوصاف، اور انسانی کمزوریاں اور ناکامیاں دیکھنے کی طرف جائیں ہی نہ بلکہ وہ ایک ایسا ماحول ہوتا ہے جو صرف اور صرف پرستش کی طرف لے جاتا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ سندھ کے عوام کو شاہ لطیف کے عرس کے نام پر ڈھول پتاشوں، اور وزیروں گزیروں کی ہوٹر بجاتی گاڑیوں، کے حوالے کیا گیا ہے۔ (بھئی کون حق دار ہے شاہ لطیف کے مزار کو غسل دینے کا؟ اُس شریف انسان نے تو سسی کے باب میں کہا تھا ''وہی سب سے آگے ہوگی جو کچھ بھی اپنے ساتھ نہ لے چلے گی'')۔

دنیا بھر میں ''تصوف'' کی اصطلاح دے کر اُسے اس طرح پیش کیا گیا کہ گویا اس میں ترکِ دنیا، اور خاموشی کا پہلو حاوی ہے۔ دانشورانہ ثبوت سے مبرا، منطق و استدلال سے پرے والی دنیا۔ بس وہاں کا دھاگا کلائی یا گلے میں باندھ لیا اور سارے مسائل اُسی دھاگے کے حوالے کر کے خاموش بیٹھا جائے۔ اِسی پہلو نے جبر و استحصال پہ مبنی عہدِ ملوکیت اور جاگیردارانہ سماج کو بچائے رکھا۔ چنانچہ ملّائیت اور خانقاہیت میں طریقِ کار میں فرق کے علاوہ کوئی خاص فرق نہیں رہا۔ مقاصد یا نتائج ایک ہی تھے۔ صوفی گیری جاگیرداری کا سیفٹی والو ہے، اُسے تباہی سے بچانے والا فکر ہے۔ یہ عوام کے اندر انقلاب اور جدوجہد کے موجزن جذبوں کو مفاہمت و مصلحت کی راہ دکھانے والا فلسفہ ہے۔ اس فلسفے والوں نے اپنے ساتھ ہونے والے ہر ناروا سلوک اور ظلم کو

رضائے الٰہی سمجھ کر قبول کرنے اور اس پر شاکر رہنے کا راستہ اختیار کیا۔ خصوصاً ہماری حکومتیں اور ہماری صحافتی صنعت اُن لوگوں کو خوب اچھالتی ہے جنہوں نے ظلم و جبر کے خلاف عوامی مزاحمت کو کند کر دیا ہو۔ اور شاہوں جاگیرداروں کے ظلم کو گردشِ افلاک قرار دے کر خاک بسر عوام کو سر اٹھا کر چلنے کی جسارت سے محروم رکھا ہو۔ خانقاہوں کے گدی نشین (بقول اقبال ،مجاور یا گورکن) نذرانے وصول کرتے رہے۔ درگاہوں کو سجدے اور بوسے دلاتے رہے اور اپنی کرامتوں کے چرچے کرتے اور کرواتے رہے۔

یہ ایک ایسی گہری سازش ہے کہ اِن بڑی ہستیوں پر تحقیق کرنے والے بھی بجائے اِن ہستیوں کے ''شناس'' بن جائیں وہ اُن کے ''پرست'' بنا دیے جاتے ہیں۔

ایک اور کھیل رومی و شاہ عنایت و مست ولطیف کی فکر کے ساتھ یہ کیا گیا کہ اُن کے دو چار اشعار اٹھا کر عقل و تفکر کو دے مارے اور اعلان کیا کہ یہ بزرگ لوگ جنون و عشق ہی کی تلقین کرتے رہتے ہیں اور عقل اُن کے ہاں توہین و ذلالت کی چیز ہے۔ سماج میں سٹیٹس کو کی قوتیں یہی چاہتی ہیں کہ ہمارے ان بزرگوں کو اس طرح پیش کرتے رہیں جہاں عقل کا استعمال شیطانی کام قرار پائے۔ عقل تو تقلید کا بیڑہ غرق کرتا ہے۔ اور تقلید کا بیڑہ غرق ہو جائے تو سجادہ نشین و مخدوم کا بیڑہ غرق ہو جائے۔ اور نتیجے میں سارا فیوڈل نظام دھڑام سے گر جائے۔ جاگیردار ایسا کرنے کہاں دیتا ہے!!۔

معلوم بات ہے کہ حاکم و محکوم، ظالم و مظلوم اور مفت خور و محنت کش کے درمیان ازل سے لڑائی جاری ہے۔ اور اس لڑائی کو کند کرنے کے لیے حاکم ہمیشہ نئے نئے ''ازم'' ایجاد کر کے عوام الناس میں پھینک دیتے ہیں۔ صوفی ازم ایسا ہی ازم ہے۔ یہ سرکاری لفظ ہے، یہ سامراجی اصطلاح ہے۔ سندھ، جنوبی بلوچستان اور سرائیکی علاقے میں صوفی ازم بہت زیادہ مقبول ہے۔ مگر کیا وہاں عورتیں ہر سال سیکڑوں کی تعداد میں قتل نہیں ہوتیں؟۔ کیا وہاں قتل و انتقام، ڈاکو اور بھتہ اور اغوا برائے تاوان سب علاقوں سے زیادہ نہیں ہے؟۔ کیا وہاں رشوت خوری سفارش اور امتحانوں میں نقل میں کوئی کمی آئی ہے؟۔ کیا جاگیردار صبح شام شاہ لطیف کے قصیدے گانے کے باوجود کسانوں کے

استحصال میں کوئی کمی کرتا ہے؟۔ کیا وہاں سارے صوفیوں کے کلام م عرسوں اور دھمالوں نے فیوڈل ازم میں کوئی ڈنٹ پیدا کیے ہیں؟۔

صوفی ازم ایک غیر اطمینان بخش اور متنازع نام ہے جس کا عقیدہ کی داخلی حقیقت کے مختلف سماجی و اداراتی مظاہر پہ اطلاق کیا جاتا ہے۔ ہمارے لکھاریوں کے پاس تصوف نامی مہمل لفظ کو بیان کرنے کی کوئی حتمی تعریف نہیں ہے۔ اِدھر اُدھر کی ٹامک ٹوئیاں مار کر خود کو صوفی سنت و بھگت ثابت کرتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ'' تصوف کا لازمی وظیفہ سلوک اور باطن کی پاکیزگی سے عبارت ہے''۔ ''سلوک'' بھی مہمل لفظ اور ''باطن'' بھی دھند میں لپٹا لفظ۔

پھر وہ ایک اور زنگ آلود عینک قاری کو پہناتے ہیں: ''تصوف کا عمومی مرکزہ خدا، انسان اور وقت کی تقویم پر استوار ہے''۔ اس ضمن میں وہ ''صوفیانہ واردات'' کا لفظ بھی استعمال کرتے ہیں۔ وہ اچھا کرتے ہیں کہ صوفیوں کی ایک لسٹ بھی عطا کرتے ہیں۔ ہمیں آسانی ہوگی اُن کے درمیان مشترک قدریں تلاش کرنے میں۔ ''داتا گنج بخش، فرید گنج شکر، گورو نانک، میاں محمد بخش!!

اور کوئی مشترک قدر ہو تو ملے۔ صوفی گیری کوئی واحد اور متشکل مکتبہ فکر نہیں ہے۔ یہ بہت ہی وسیع اور متفرق، حتیٰ کہ مخالف و متصادم نظریات کو زبردستی اکٹھا کرنے اور مال بنانے کی کوشش کے سوا کچھ نہیں۔

'' صوفی'' ایک ایسا نام ہے جسے پاکستانی مڈل کلاسز نے اعزاز کا تمغہ سمجھا ہے اور دوسروں نے رسوائی کی اصطلاح۔ (2) یہ اصطلاح اب ایک نمائندہ لفظ نہیں رہا ہے۔ اسے ترک کر دینا چاہیے تاکہ اچھے انسانوں کو کسی ابہام کے نقاب کے بجائے براہِ راست اُن کی تعلیمات سے پہچانا جا سکے۔

پھر یار لوگوں کے اڑائے ہوئے اس کنفیوژن میں بھی کوئی حقیقت نہیں کہ سارے صوفی سلسلے اسٹیبلشمنٹ کے مخالف ہیں۔ بھائی مغلوں سے لے کر بیگوں تک اور انگریزوں سے لے کر بعد کے حکمرانوں تک کو اگر صوفیوں، درباروں، سجادہ نشینوں کی اکثریت کی حمایت حاصل نہ ہوتی وہ یوں دھڑلے سے حکمرانی کر سکتے؟۔ بس ایک ہمارا مرشد صوفی شاہ عنایت ہے جسے یہ لوگ ہر ہر جگہ اپنے

دکھانے کے دانت بنا کر پیش کرتے ہیں۔

کچھ باتیں سجادہ نشینوں، گدی نشینوں اور ملاؤں کے بارے میں بھی کہنی ضروری ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ سمجھا جاتا ہے کہ دنیا بھر میں عموماً، اور بالخصوص امریکہ اور یورپ کے صنعتی ممالک میں تو مذہبی اسٹیبلشمنٹس کارپوریشنیں بن چکی ہیں اور کارپوریٹ سیکٹر کی طرح سیاست میں مداخلت کرتی ہیں۔ مگر یہاں ہمارے منطقے میں اور بالخصوص بلوچستان میں تو گزشتہ ربع صدی سے یہ طبقہ باقاعدہ سیاست، اور یوں اقتدار میں آچکا ہے اور باقاعدہ درجن بھر صوبائی وزیر رکھتا ہے۔ ہر سال ہر صوبائی اسمبلی کے ممبر کو پچیس کروڑ روپے ملتے رہے ہیں۔ پانچ سال تک ہر وزیر سوا ارب روپے کا مالک۔ یوں وہ اپنے طبقے کی بہت خدمت کرتے رہے ہیں؛ اداراتی انداز میں۔ ایسی خدمت کہ آج کا یہ روحانی سیاسی لیڈر اب پہلے والا ملاّ نہیں رہا۔

اب روحانی و مذہبی اسٹیبلشمنٹ کسی بھی دوسرے سیکٹر (صنعتی، کمرشل یا سروسز) کی طرح معیشت کا حصہ ہے۔ یہ سروسز سیکٹر کا حصہ ہے۔ معیشت کا مذہبی سیکٹر لاکھوں لوگوں کو ملازمتیں دیتا ہے اور وہ کاروباروں، عام ملازموں اور چھوٹے دکانداروں پر مشتمل ہے۔ مذہبی سیکٹر بقیہ معیشت کی طرح مشینی بن جانے، کمرشلائزیشن اور مانیٹرائزیشن کے ساتھ ڈھال دیا گیا ہے۔ ہماری روایتی معیشت میں ملاّ اور گدی نشین دوسرے دست کاروں جیسے ہوتے تھے جو کہ مرگوں، پیدائشوں، شادیوں، ختم درود، اذانوں، امامت اور بچوں کو ناظرہ قرآن پڑھانے اور دوسرے بنیادی دینی امور سکھانے کی خدمات مہیا کرتا تھا اور وہ، یا اس کا جونیئر اپنے خاندان اور دوسرے ساتھی ملاؤں کے لیے دو وقت کی روٹی گاؤں کے گھروں سے جمع کرتا تھا۔ دیگر دست کاروں کی طرح اسے ادائیگی فصل پکنے پر اجناس کی صورت ہوتی تھی۔ اہم خاندانی یا کمیونٹی معاملات میں اس سے مشورہ نہیں کیا جاتا تھا۔ مگر اب دوسرے دست کاروں ہی کی طرح ملا و سجادہ نشین بھی محترم بن گیا جو اپنی خدمات جنس کے بجائے نقد پیسے پر فروخت کرتا ہے۔ ان کے ترقی یافتہ مقام نے انھیں خاندان اور کمیونٹی معاملات میں حصہ لینے حتیٰ کہ ان میں مداخلت کا موقع فراہم کیا ہے۔

ایک اور بڑی تبدیلی نے بھی ملا اور سجادہ نشین کو فائدہ بخشا۔ پرانے زمانوں میں ملا بچوں

کو مسجد میں گروہ کی صورت میں پڑھاتا تھا اور سجادہ نشیں ہسٹیر یا اور نظرِ بد کا دم پھُونکا کرتا تھا، مگر اب صورت حال بدل گئی ہے۔ اب ملا اور سجادہ نشین روحانی رسومات کے لیے اچھی خاصی ہفتہ وار یا ماہانہ فیس لیتا ہے۔ اس تبدیلی نے ان کو معاشی طور پر ایک محفوظ مڈل کلاس کا شخص بنا دیا۔ انہیں خوراک مانگنے جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ اکاؤنٹنٹ یا وکیل کی طرح کا ایک پروفیشنل بن چکے ہیں۔ نئی پولیٹیکل اکانومی اُن کے لیے کافی معاشی مواقع لائی۔

اس پس منظر میں محض امریکہ، عرب ممالک یا جاسوسی اداروں پر ملاّ اور سجادہ نشین کو طاقت ور بنانے، یا ان کا رول تبدیل کرنے کا الزام دینا کافی نہیں ہے۔ ہمیں علم ہونا چاہیے کہ مذہبی تبلیغی طبقہ کافی خوش حال ہو گیا ہے اور وہ خود سے فنڈ پیدا کر سکتا ہے۔ مذہبی تبلیغی طبقے کی پولیٹیکل اکانومی میں اس تبدیلی کو سنجیدہ لینا چاہیے!۔ اور عرسوں، سجادہ نشینیوں، تبلیغی اجتماعات اور مذہبی سیاسی پارٹیوں کی کامیاب بقاودوام کو سرمایہ دارانہ نظام کا مظہر سمجھنا چاہیے۔ اس نئے معاشی طبقے کو حسبِ سابق فیوڈل رشتوں میں نہیں دیکھنا چاہیے۔ یہ روحانی طبقہ سرمایہ دارانہ معاشرے کا حصہ ہے اور اُس کے بالائی طبقات میں شامل ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ روحانی پیشوا جاگیرداری سے سرمایہ داری نظام میں آن شامل ہوا جب کہ ملاّ جاگیردار بنے بغیر ڈائریکٹ جست لگا کر سرمایہ داری نظام کے اوپری، یا، اوپری درمیانہ طبقے میں ترقی کر گیا۔

اور انہی بالائی طبقات کی پاکستان میں حکمرانی ہے۔ یہاں کی ہر سرکار ایک ایسی سرکار رہی جو اُنہی خیالات کو پسند کرتی ہے جن میں راسخ انداز اختیار انداز کرنے کی صلاحیت ہو۔ یہ سرکار ملاّ اور پیری مرشدی کو سرکاری طور پر سرپرستی مہیا کرتی ہے۔

راسخیت توجعلی سائنسوں (pseudosciences)، اور توہمات کی نرسری ہوتی ہے۔ توہمات ہمارے سماج کے اوپری طبقات کی معاشی و سیاسی ضرورت ہوتی ہیں۔ توہمات، روحانیت، راسخیت اور طبقاتی استحصال گوشت و ناخن کی طرح ساتھی بیلی ہوتی ہیں۔

چنانچہ شاہ لطیف ہو، مست توکلی ہو، یا، شاہ عنایت، ہر سرکار کی کوشش ہوتی ہے کہ اُن کی تعلیمات چھُپا دی جائیں، اور انہیں کرامتوں معجزوں سے بھر دیا جائے۔ ان ''کی'' شاعری کے

بجائے اُن ''پر'' کی گئی شاعری کو فروغ دیا جائے ۔جس میں روحانی کی بجائے اُن کے جسمانی حسن کے تذکرے ہوں۔اُن کی محنت کے بجائے کرامت کی باتیں ہوں۔اور وہ جیتے جاگتے ، دکھ تکالیف جھیلتے ہوئے ، جدوجہد میں مصروف انسانوں کے بجائے پنجابی فلموں کے سلطان راہی دکھائے جائیں۔جو عوام الناس کو شامل کیے بغیر سارے دشمنوں کا تن تنہا صفایا کر دیں اور ایک ہی گنڈاسے کے وار سے درجنوں دشمن مار دیں .....اور ہم تالیاں بجائیں (ہمیں گذشتہ نصف صدی سے تالیاں بجانے کا عادی بنا دیا گیا۔مشاعروں میں ''واہ واہ'' ،قوالیوں میں ''حق حق'' پر لگا دیا گیا)۔

ذرا سوچیے اگر ان بزرگوں کی کرامت میں اولاد دینے ،روزی میں برکت ڈالتے ،اور دشمن کو زیر کرنے والا عقیدہ ختم ہو جائے تو کیا پھر بھی ان کے عرس اس قدر میلہ والے ہوں گے؟۔کیا پھر بھی وزیر اعظم وصدر ان کے مزار کو غسل دینے آنے کی ضرورت محسوس کریں گے؟۔کیا پھر بھی دانشوروں کو ان پہ سیمینار کرانے ہانکا جائے گا؟۔کیا پھر بھی امریکی وزیر خارجہ کو دوپٹہ پہنوا کر اِس مزار پر لایا جا سکے گا؟۔کیا پھر بھی بے نظیر بھٹو کو کسی سجادہ نشین کے پائنتی تقدس میں ملبوس بٹھایا جا سکے گا؟۔لگتا ہے کہ پھر، وہاں کوئی نہیں ہوگا،صرف ہم ہوں گے۔.....ہم جنہیں پتہ ہے کہ مست ولطیف ورومی شاعر ہیں۔انسان کی زندگی کے شاعر ہیں۔دانش ور و مصلح وانقلابی شاعر۔وہ موسیقی پسند ہیں،رقص وسرود حرکت وجنبش وتحریک کے راہبر ہیں،فرقہ بازی سے نفرت کرتے ہیں۔عوامی تحریک بھی موسیقی کے اصولوں پر، رقص کے قوانین پر چلاتے ہیں۔جب بگ بینگ ہی میوزیکل ہے تو عوامی تحریک بھلا میوزیکل کیوں نہ ہو۔موسیقی ہی وفطرت وکائنات پہ محیط ہے۔

ہم جنہیں پتہ ہے کہ بھنگ کا ایک کٹورہ پینے سے آدمی شاہ ولطیف ومست نہیں بن سکتا۔جسے دل کی جڑوں تک انسانیت سے پیار نہ ہو، وہ کبھی اِن بڑے انسان دوستوں کا پیروکار نہیں بن سکتا:

تر اگاہے گریبا نے نہ شد چاک
چہ دانی لذت دِیو انگی را

یہ نہیں ہوسکتا کہ آپ ذہنی طور پر بادشاہ بھی رہیں ، وزیر وگزیر بھی رہیں،سیکریٹری وکمشنر بھی رہیں اور لطیف ومست وعنایت سے متعلق بھی ہوں۔محض ایک قوالی، رقصِ درویش کے ایک پروگرام میں بیٹھنے اور جھوم کر واپس آنے سے ''صووفی ازم'' نہیں پھیل سکتا۔اوپری طبقات کے چونچلے ہیں سب۔

تو پھر،ہم کیوں تلے ہوئے ہیں مست توکلی کے لفظ ''بھنگ'' کو صرف ایک معنی تک محدود کرنے کو۔ہم کب سے شانتی کو اُس کے اسباب وعلل سے علیحدہ کرنے کے گناہِ عظیم کے مرتکب چلے آرہے ہیں۔کیا ایسا تو نہیں کہ ہم جانتے ہوئے یا انجانے میں کسی ملا مولوی کے کہنے پہ شاہ عنایت کو ''صوفی'' قرار دے کر اُسے نجات کے کاروان کی سربراہی سے ہٹانے کے قبیح عمل میں ہاتھ بٹا رہے ہیں؟۔یا ہم معمولی ماروی کو عمر بادشاہ سے لڑانے والے شاہ لطیف کو پنہوں کے بھائیوں سے مصالحت وہم آہنگی والے مردار خوروں کی صف میں کیوں ملا رہے ہیں؟۔یا پھر،ہم ''ان الحق'' کو بہت بدصورتی سے dilute کرانے میں لگا دیے گئے ہیں۔ہم ملنگ رحمٰن کو ملک عزیز خان سے یاری کرانے کا کبیرہ گناہ کر رہے ہیں۔ہم ''مالک کے در پہ حاضر کتے کی حاضری'' جیسے فقروں کو تقویت دے کر انسان کی توقیر کو گھٹانے کے کام پر لگ گئے ہیں۔ہم کیوں رقصِ درویش پہ کو نیا کے سجادہ نشیں کی تقریر کو ترجیح دے رہے ہیں۔ہم آخری دم تک نطق وشعر کی عظمت کی امین اور محبت کی سرفرازی کے لیے حمام میں سسک سسک کر جان دینے والی خضدار کی شہزادی کو حارث کے ساتھ کیسی ہم آہنگی کی اگربتی میں دفن کر رہے ہیں؟۔ہم نے منطق الطیر کی ساری منطق کو میدانِ تلاش میں جدل وجدال کے بجائے دربار میں دھمال کا منطق بنا ڈالا ہے۔ہم کیوں آستینیں چڑھا کر سسی ، ہیر،سوہنی، ماروی،مومل،سمو جیسے رومانی کرداروں کو زمین بدر کر کے حقیقی مجازی کے جہنم میں جلنے دیتے ہیں یہ جانتے ہوئے کہ زمینی ہی حقیقی ہوتی ہے۔ہم توکلی مست کو قوی سرداروں کے ساتھ کیوں مشرف بہ رواداری کرانے پر تلے ہوئے ہیں۔روادار لوگ تو ملّا سے نہیں بھڑتے!۔جس دن بلے شاہ کا پیلا چولا اجمیر کے مجاور کے دمکتے چوغے میں بدل جائے اُسی روز پہاڑ روئی کے گالے بن جائیں۔ایک بنیاد پرست غیرتی سماج میں حسین ، مادھو سے عشق کر کے کفر کی تحریک

شروع کرتا ہے، حیرت ہے کہ ہم اس کے نام پہ قائم انکار کی مجلسِ شوریٰ میں بیٹھ کر ہارس ٹریڈنگ کی ایجنسی کی ٹکٹ پر اُس کو آئین و رواج کا پابند ثابت کر رہے ہیں۔ ہمیں کیا ہوگیا ہے کہ ہم ''پٹ انگریزی تھانے'' کہنے والے فرید کو ہی امریکی سامراج سے رواداری کا علم بردار بنا رہے ہیں۔ ہمیں کون سا مشروب پلا دیا گیا ہے کہ ہم فلسفہ سے اُس کی جان، یعنی اینٹی تھیسز ہی نکال دینا چاہ رہے ہیں۔ بھلا ایسا کیا ہوگیا ہے کہ اچانک اسلام آباد و واشنگٹن میں ہمارا درویش فلاسفر، توجہ کا مرکز بن چکا ہے۔ ایک اس کا مقبرہ بم سے اڑا کر اُسے توجہ کا مرکز بنا رہا ہے اور دوسرا اُسے ایک ایسے سماج میں شانت رہنے کا راہبر بنا رہا ہے جہاں ظلم موجود ہو۔ کیا ہم اتنی پست عملی کے دور میں ہیں جہاں ہمیں ''دھمالی چرسیوں'' اور ''مزار ماروں'' ہی میں سے ایک کا انتخاب کرنا پڑ رہا ہے؟۔ فلاسفر خود کہاں گیا؟ فلاسفر کی تعلیمات ہم نے کہاں گم کر دیں؟۔ مشرق کے ہمارے فلاسفروں کے پاس کچھ تو ہے جو مقتدرہ کے لیے خطرہ ہے ورنہ ایسا کیوں ہے کہ ہم نے جھوک میں چار ماہ تک کی گوریلا جنگ کرنے اور چوبیس ہزار مرد عورت کسانوں کی شہادت پیش کرنے والے کے مقبرے پر ''یہاں عورتوں کا داخلہ ممنوع ہے'' کا بڑا بورڈ برداشت کر رکھا ہے۔ ایسا کیوں ہے کہ عنایت ولطیف وسچل کے مقبرے والی قبرستان میں ہندو دفن ہیں اور اُن کی قبروں پر آیتیں کندہ ہیں اور کسی ملّا ملٹر کو اس پہ کبھی اعتراض نہ رہا۔ مگر آج شیعہ سنی ایک دوسرے کے قبرستانوں میں دفن نہیں ہو سکتے؟۔ ورنہ ایسا کیوں ہے کہ سسی کو پیہم جدوجہد کی تلقین کرنے والے شاہ کے مزار کو مردار خوروں کے ساتھ چادریں چڑھوا کر اس کے یوم پیدائش کا افتتاح کرنے کا موقع دے رکھا ہے۔ ورنہ ایسا کیوں ہے کہ آزادیِ وطن کے لیے تلوار اٹھانے والے مست توکلی کو ''سب'' کی خیر مانگنے والا بنا کر پیش کرنے کی تدابیر ہو رہی ہیں؟۔

ایک شخص اپنی ساری زندگی انسانوں کی خدمت پر لگا دے اور پھر مرنے کے بعد اس کی تعلیمات کا مغز چوری کیا جائے اور اس کا مقدس مزار، بھنگ اور چرس پینے والے موالیوں کے حوالے کیا جائے۔ جرم نہیں، یہ تو جرمِ کبیرہ ہے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ بے کاری، ہمہ وقت غنودگی اور حجام وحمام سے حتمی ناواقفی، سے سرشار لوگوں کو ہم نے سب سے متحرک انسانوں کا سجادہ سونپ رکھا ہے۔ اُن کے دربار میں جا کر دیکھو تو

اُن کے سند یافتہ مرید بزدلی، خود ہتکی، خود تحقیری، اور اطاعت شعاری کے مجسم نمونے نظر آتے ہیں۔ ارے بھائی! ہماری یہ حرکت ایک ناقابلِ معافی جرم نہیں تو کیا ہے۔ جو نظریہ بھی موجودہ بے انصاف سماج کے خلاف انسانی نفرت کو گھٹانے کا باعث بنے، وہ عوام دشمن ہے۔ اور بالخصوص جب بہت بزرگ و بہترین انسانوں کی عوامی مقبولیت کو انہی بڑی شخصیات کی اپنی تعلیمات کو پس پشت ڈالنے کی سازش غیر محسوس طریقے سے کی جائے تو یہ سب سے گھناؤنی حرکت ہے۔ بقول فلسطینی شاعر سمیح القاسم:

کتنی صدیوں سے ہم ان مزاروں کی پوجا میں مصروف ہیں
جو بزرگوں کی تقدیس کے نام پر
کچھ کرائے کے مذہب فروشوں کی روزی کا سامان ہیں
بے بصر سائلوں اور بے کار لوگوں کی پہچان ہیں!

عقیدہ پرستی کے گراؤنڈ پر سائنسی سپورٹس کے ٹورنامنٹ نہیں کیے جاتے۔ عقیدہ پرستی (پیر پرستی، کرامت پرستی) سے ہمارے خطے کے عوام پہلے ہی اوورڈوز ہو چکے ہیں۔ بے شمار مذہبی فرقے بننے شاید اہم نہ ہو مگر اُن فرقوں کے نام پر انسانوں کے گروہی قتل قتال تباہ کن ہوتا جا رہا ہے۔ اس وقت یہاں ایک فرد کے بے شمار دشمن ہیں، یہودی دشمن، مسیحی دشمن، بدھسٹ دشمن، بے مذہب دشمن، ہندو دشمن، اپنے لباس کی رنگت کے علاوہ باقی سارے رنگ اپنے فرقے کے علاوہ سارے مسلمان دشمن.....بقول، جون ایلیا:

؎ اب سبھی کو سبھی سے خطرہ ہے

نتیجہ یہ نکلا کہ یہ محض وقتی صورت حال نہیں ہے۔ اب ذہنوں میں راسخ انداز میں ماضی پرستی، قدامت پسندی، عسکریت پسندی، عدم برداشت جم چکی ہے۔ اب ہم سب کے سب موسیقی دشمن ڈرامہ، قبائلی رقص، اچھا لباس دشمن، منطق دشمن، عقل دشمن، حقیقت پسندی دشمن، زندگی دشمن، دنیا دشمن، انسان دشمن بن چکے ہیں۔ ہم بے عملی، ان پڑھی اور توہم پرستی کو ایک اجتماعی نام ''صوفی ازم'' دینے میں لگے ہوئے ہیں۔ ایسی مذہبی اشرافیہ پرستی جو ہمیں آٹو میٹک طور پر پیر پرستی کی طرف

لے جائے گی۔ (اگلی مصیبت یہ ہے کہ سارے پیر سندھ و پنجاب میں ہیں۔ جہاں کی جاگیرداری انسان کو کاہلی سستی سے نکلنے ہی نہیں دیتی)۔ وہاں پیر اور جاگیردار ایک ہی شخص میں متشخص ہیں۔ یوں ہم ایک ملائیت سے نکل کر دوسری ملائیت کو مضبوط کر رہے ہوتے ہیں۔ گدیاں، جاگیریں مضبوط کر رہے ہیں۔

مغربی سرمایہ داری اچانک ہمارے اِن حکیموں داناؤں سے کیسے متاثر ہوئی ہے؟۔

رومی کا پیغام کیٹ واک سے میڈونا کی آواز میں نشر ہوتا ہوا ہم تک نہیں آیا اور نہ ہی قونیہ کے مجاوروں کے رقصِ درویش کی کوریوگرافی اُسے ہم تک لایا۔

میں حیران ہوتا ہوں کہ صوفی ازم کے اِس ''پنج'' کی مالی امداد مغربی ممالک کے ''این جی اوز'' کرتے ہیں۔ تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا وہاں مغرب کے سماج، صوفی ازم کی بدولت اس قدر ترقی کر چکے ہیں؟۔ وہاں کوئی اصلی نقلی مزاریں کیوں نہیں ہیں؟۔ شیکسپیئر کا مزار، کانٹ کا دربار، سارتر کا روضہ، پشکن کا آستانہ.....۔ یا اگر وہ اب جا کر عقل مند ہو چکے ہیں تو کوئی سجادہ گدی وہاں کیوں نہیں بناتے؟۔ اور وہاں اپنے گدی نشینوں، سجادہ نشینوں اور خلیفوں کو وزیر، وزیرِ اعلیٰ، سپیکر یا حتیٰ کہ وزیرِ اعظم کیوں نہیں بناتے؟..... اس لیے کہ اُن کا سماج انہیں جوتے مارے گا۔

مغرب کے ہاں تو انقلابِ فرانس دلیل، استدلال اور منطق کی فتح تھی تو اہمات پہ۔ والٹیر، روسو، ڈائیڈ روٹ، مونٹسکو، رابسپائرے، ڈینٹن نے ملّا پیر، گنڈے، دم چھو کا بھٹا بٹھا دیا۔ فلسفیوں کے فلسفہ کی بارود سے نکلے ''انقلابِ فرانس'' نے لبرٹی، برابری اور برادری جیسے سیاسی خیالات کو ہزار گنا حجم میں ہزاروں گنا تیز رفتاری سے پھیلا دیا..... یوپ سے نجات کی ہوا ایسی چلی کہ یورپ و امریکہ اس کی لپیٹ میں تھے۔ اور وہ بے چارہ محض کپڑوں کے ضیاع کے لیے رہ گیا ہے۔ چوغہ در چوغہ!!

یوٹوپیائی تحریکیں، روشن خیالی کی تحریکیں، پیرس کمیون، امریکی انقلاب، روس کا 1905 کا انقلاب.....اور پھر پوسٹ ٹکنالوجیکل انقلاب۔ وہ دن اور آج کا دن امریکہ و یورپ

اپنے اپنے تجربات سے گزرنے کے بعد داخلی پالیسیوں میں (بہت کم رفتاری سے سہی، اور زبانی جمع خرچ کے بطور ہی سہی) انقلابِ فرانس کے نقشِ قدم سے ریاستی طور پر ایک انچ بھی اِدھر اُدھر ہونے کی جرات نہ کر سکے۔ اُن کا جدید ریاستی ڈھانچہ دھڑام سے گر جائے گا۔

اٹھارویں صدی تک یورپ و امریکہ اور انیسویں صدی تک بلوچستان و آس پاس جتنے بھی فلاسفر (حکیم) پیدا ہوئے وہ سب کے سب صنعتی دور سے پہلے کے تھے۔ وہ نیک نیت لوگ اُس زمانے کے انسان کو درپیش درد و تکالیف ہی بیان کر سکتے تھے۔ نعم البدل بھی نیم سائنسی ہی پیش کی جا سکتی تھی۔ اینگلز نے کہا تھا:

''ازمنہ وسطیٰ کے عارف جنہوں نے آنے والے ملینیم کا خواب دیکھا، طبقاتی مخاصمت کی ناانصافی کا پہلے سے شعور رکھتے تھے''۔ مگر آنے والا وہ ملینیم کیسا ہوگا، اُس میں موضوعی قوتیں کیا ہوں گی اور تضادات کس طرح ظہور پذیر ہوں گے، یہ تفصیلات تو ظاہر ہے کہ اُن عارفوں کے پیراڈائم سے ہزاروں شمسی سال دور تھے، وہ ملینیم اس حقیقت میں نمودار ہوا کہ جدید بڑے پیمانے کی صنعت آئی۔ اُس نے ایک بالکل ہی نیا وجود پیدا کیا..... صنعتی مزدور، پرولتاریہ''..... ایک طبقہ کو جو تاریخ میں پہلی بار اِس یا اُس خاص طبقاتی تنظیم کو ختم کرنے کا مطالبہ کر سکتا ہے ..... بلکہ خود طبقات کو بھی''۔ (اینگلز۔ اینٹی ڈوہرگ۔ صفحہ 145)

شاہ لطیف کو عوامی خوش حالی کی جنگ میں ایک راہنما سے ہٹ کر دیکھنا اسی جرم کا مرتکب ہونا ہے۔ طے بات ہے کہ شاہ لطیف بارش نہیں برسواتا، اولاد نہیں بخشتا، حکمران کی بادشاہت کو طول نہیں دلاتا، اور اَنہونی کو ہونی اور ہونی کو انہونی نہیں کر سکتا۔ ہاں، اس کی زندگی کے حالات کا مطالعہ اور اس کی تعلیمات کو راہنما بنانے سے نہ صرف ہمارے جمالیاتی پہلو کی تسکین ہو جاتی ہے بلکہ زندگی کی پُر پیچ میں سے راستہ تلاش کرنے میں بڑی راہنمائی ملتی ہے۔ وہ پیر نہیں، ہمارا راہنما ہے۔ وہ صوفی نہیں فلاسفر، حکیم اور دانا ہے، ہمارا فکری عملی لیڈر ہے۔

شاہ لطیف ہمارا راہنما کیسے ہے؟ ابھی بتاتا ہوں۔

الیکٹران مائیکروسکوپ میں بھی بہ مشکل نظر آنے والے معمولی وائرس سے لے کر امریکہ

جیسی سپر پاور کی عداوت کے باوجود زندگی ہے کہ ختم ہونے میں نہیں آتی۔ پیرا سائنسز کی گمراہ کن اٹھکیلیوں کے باوجود سائنس کی تجلی نے گیارہ ہزار سال قبل مہر گڑھ کے فرد کی پچیس سالہ اوسط زندگانی کو بڑھا کر ستر برس تک پہنچا دیا ہے۔.....زندگی.....زندگی کائنات کی سب سے بڑی نعمت ہے۔ زندگی ہی کو ثبات ہے، زندگی کے سُر تال کو، گیت ونغمہ کو، رقص وخرد کو دوام ہے۔ زندگی جو کبھی مست بنتی ہے اور کبھی مست کی محبوبہ سمو۔ زندگی جو کبھی مجازی نہیں ہوتی، ہمہ وقت حقیقی رہتی ہے۔ کوئی شخص زندگی اور زندگی سے متعلقہ باتوں کو نظر انداز نہیں کرسکتا۔.....اور شاہ لطیف تو حساس ترین انسانوں میں سے ایک تھا۔ اُس نے زندگی کو اُس کے ہر ہر پہلو سے دیکھا، پرکھا، بھگتا اور اس کے بعد ہی احسن طور پر زندگی کی عالم گیر سچائیوں کو بیان کیا، اُن پر چلنے والی زندگی گزارنے کے طریقے بتائے۔ اسی سبب وہ ہمارا رہنما ہے۔

زندگانی کے رواں دواں قافلے میں کسی بھی بزرگ (فلاسفر) کا پہلے سے موجود ہزاروں بزرگوں سے واسطہ پڑنا لازم ہے۔ ایسے بزرگوں سے جو تصور کی حد تک بھی ناقابلِ رسائی محبوب تلاش کرتے ہیں اور ''معروض'' کی اپنی آنکھ سے اسے تجسیم کرتے ہیں اور پھر اُس کی بلائیں لینے، اُس کی خدمت کرنے اور مولانا روم کے بقول اُس کی جوئیں نکالنے کی حسرت جپتے رہتے ہیں۔ اور بزرگ، کے لیے بالکل ضروری نہیں ہوتا کہ وہ بڑا عالم ہو یا رات دن زہد وعبادت میں غلطاں ہو۔ ہر عام آدمی، بغیر گردن اکڑائے دوسرے عام انسانوں کی طرح، اور ان سے بے تکلفی میں اپنی زندگی گزارنے والا ہر اچھا انسان ایک بزرگ ہے۔ انسان ذات کا ہر ممبر ایک بزرگ ہے۔ گندم کے ایک دانہ کو چار انچ گہرائی میں دفن کرکے زمین سے پورا خرمن گندم کشید کرنے والا اگر بزرگ نہیں ہے تو پھر بھلا بزرگ ہے کون؟۔

اچھا، شک ہے تو ذرا زرتشت کے 'اوستھا' کو گواہ بناتے ہیں:

''اور وہ جو دونوں بازوؤں سے زمین کو کاشت کرتے ہیں، ان سے زیادہ مبارک اور سعید ہستیاں روئے زمین پر نہیں۔.....معزز ترین، عظیم ترین، مبارک ترین ہیں وہ جو غلہ بوتے ہیں، اسے سینچتے ہیں اور اسے کاٹتے ہیں۔.....وہ اہورا مزدا

کی تخلیق کے منصوبے کو پورا کرتے ہیں اور جب جو کی بالیاں پکتی ہیں تو اہرمن کا رنگ فق ہوجاتا ہے اور جب دانے ان کے گھروں میں آتے ہیں تو ارواحِ بدزار وقطار روتی ہیں اور جب اناج پیسا جاتا ہے تو تاریکی اور بدی اور اہرمن، ان کے گھروں سے سرپٹ بھاگ نکلتے ہیں کیونکہ اناج اور آٹا ان کی موت ہے۔''

اگر اینگلز نے انگلستان میں مزدوروں کے حالات کو تفصیل سے بیان کیا تھا تو شاہ لطیف نے اپنے دور کے سماج کی طبقاتی تفصیلات بیان کی تھیں۔ شاہ کی شاعری سے اُس سماج کے سیاسی ومعاشی ماحول میں کلچر کو ترقی دینے والی ترغیبات وموثرات بہم ہوتے ہیں۔ ٹھیک ہے کہ موقع پرست ادیبوں عالموں کی بزدلی کے سبب، سجادہ نشینوں اور ان کے ہم نوا بورژوا دانش وروں نے شاہ کو نظریہ دان نہیں مانا اور فلاسفر کے بجائے ''پیر'' بناڈالا۔ مگر شاہ نے زندگی کے آئیڈیلزم اور حقائق کو بہت خوب صورتی سے یک جا کردیا۔ اس نے حیات انسانی کی اجتماعی جدوجہد کا زبردست ادراک کیا۔ شاہ کا کلام کیا ہے؟: اعلیٰ ومثالی عالم گیر انسانی اقدار اور جوہر انسانیت کی دوامیت وتسلسل۔ یہ شاعری محکوم وضعیف طبقات کے بشمول پورے عالم انسانیت کی بہتری وترقی، مسرت وخوش حالی کی تمنا وترغیب ہے۔ لطیف کی وفاداری نہ صرف گل زمین سے تھی بلکہ آزادی، امن اور انسانی حقوق سے بھی تھی.....اب ہم اُس سے کمیونسٹ مینی فیسٹو تو نہیں لکھوا سکتے تھے کہ وہ زمانہ اور علاقہ مینی فیسٹو کا تھا نہیں۔ ورنہ رسالو اور مینی فیسٹو کے مغز میں کوئی فرق تو کوئی دکھلا دے!!۔ (ہاں، مقدر پرستی البتہ مینی فیسٹو میں نہ تھی کہ عینیت پرستی زرعی معاشرے کے بعد کے سماجوں میں دفعان ہونا شروع ہوجاتی ہے)۔

سچی بات ہے کہ شاہ لطیف انقلابیوں کی شوریدہ سری کو گہرائی بخشتا ہے۔ وہ عشق کو معانی عطا کرتا ہے۔ شاہ کو پڑھ کر ہی تو میں نے مستیں توکلی کو سمجھا تھا۔ شاہ نے ہی مجھے وہ رنگ عطا کردیے جس سے میں نے مست کی دنیا کو، عشاق کی دنیا کو دیکھنا شروع کردیا۔ شاہ کمٹ منٹ کا دیوتا ہے۔ وطن دوستی کے جذبے سے لطف اٹھانا ہو تو شاہ کے رسالے کی جانب لوٹ لوٹ جایئے۔ شاہ تو بھینس کے اپنے منہ میں بین دے دیتا ہے۔ شاہ کی سندھی اگر عام آدمی نہ بھی سمجھ سکے تو اس کے

ترجمے اتنے زیادہ ہوئے ہیں کہ کوئی مسئلہ نہیں رہتا۔ وہ عام آدمی کی باتیں اس کی زبان میں کرتا ہے۔ مُس کو اُس کی سادہ زبان میں زندگی گزارنے کا طریقہ بتاتا ہے:

؎ سُکھ ملے تو آپے سے باہر نہ جاؤ

اور ہم نے لطیف وعنایت وتوکلی کو یک طرفہ طور پر رحمدل کیسے بناڈالا؟۔ زندگی کا پاسباں ''سب'' کی زندگی کی خیر کیسے مانگے گا؟۔ زندگی کا پاسبان زندگی کے دشمن کے قتل کے بعد ہی زندگی کا پاسبان بنتا ہے۔.....اور گندم کے ایک دانہ کی تقریبِ تدفین سے لے کر پورے خرمن کے باسعادت وصال تک ہر کاشت کار مزاحمت کے پورے سلسلے سے ہوگزرتا ہے۔ موسموں کی حوصلہ شکن شدت کے خلاف، اپنے دائمی رفیق یعنی تساہل کے خلاف، من وسلویٰ کے دوام کے فلاسفر یعنی فیوڈل کے خلاف، اور بے کار جڑی بوٹیوں اور فصل دشمن کیڑوں کے خلاف ہم سب کا یہ پالنہار لڑتا ہے۔ مزاحمت کرتا ہے۔ یہ انسان (اور ہر انسان) موت کے خلاف لڑتے ہوئے سوسو بار موت کو قتل کرتا چلا جاتا ہے۔ ہماری روٹی کا ایک ایک نوالہ سپرے سے ہزاروں لاکھوں کیڑوں کے قتل کے بعد میسر ہوتا ہے۔ پھر، ہم سے یہ توقع کہ ہم کپاس کے خالق بھی بنیں اور امریکی سنڈی کی طوالت عمری کے دعا گو بھی، ایک مذاق بن جاتا ہے۔

کون شطرنج کا کھلاڑی ہوگا جو کائنات کے بادشاہ انسان کو، شہ مات سے بچانے کی خاطر پیادوں، گھوڑوں، اور فیلوں کی بلی نہیں چڑھواتا۔ اگر وہ تیار فصل سے بٹیروں چڑیوں کو بھوکا بھگائے گا نہیں تو وہ کیا انسان ہوگا؟۔ تپتی دھوپ میں شبنم کی موت بھی ہوتی ہے مگر گندم کے خوشوں میں رزق بھی تیار ہوتا ہے۔ کسی کسان کو بیٹھے شبنم کی موت پر روتے دیکھا ہے؟۔ تھپڑ کے لیے دوسرا گال پیش کرنے والے نے کتنے قتل کیے، حساب ہے؟۔ فریسیوں کی روزی روک کر اُن کا قتل، ماؤنٹ کے سرمن سے پورے نظام کا قتل.....یسوع جو نئے نظام کا خالق تھا، سابقہ نظام کا قاتل بھی تو تھا!!۔

لیکن مجھے یقین ہے کہ ہمارے ولیوں کے فلسفہِ مزاحمت کو اُس وقت تک کنفیوژن کے طوفان میں چھپا رکھا جائے گا جب تک کہ انصاف کے لیے اٹھ کھڑی ہونے والی عوامی قوت توانا

نہیں ہوتی۔ لطیفی فلسفہ کے مالک عوام الناس ہیں، حکمران تو اس فلسفہ کے ترمیم پسند ہیں۔ اُن حکمرانوں کا حصہ بننے کی مزاحمت کرنا ہی پیروِ لطیف ہے۔

شاہ لطیف کا سارا فلسفہ جدوجہد کا فلسفہ ہے۔ ہمت بڑھانے کا، جرأت کرنے کا، حوصلہ مندی کا۔ شاہ لطیف نے مروج کی مخالفت کی تحسین میں ساری سرحدیں پار کردیں۔.....اور محبت پہ پابندی فیوڈل معاشرے کا سب سے بڑا رواج ہوتا ہے۔ لطیف نے عشق پر پابندی کی خلاف ورزی کو نہ صرف سراہا سنوارا بلکہ اس بغاوت کی سربراہی کی۔

شاہ کی فکر تقلید کی ضد ہے۔ اور تقلید کی ضد تو فلسفہ ہوتی ہے۔ لہٰذا شاہ لطیف فلاسفر تھا۔ ہم نے پتہ نہیں کیوں ضیاالحق سرکار کو ایسے بڑے انسان کو 'تارک الدنیا' کے سانچے میں فٹ کرنے دیا؟

شکر ہے شاہ لطیف ابھی تک چالاکوں کے بنائے جتھوں کے ہاتھ نہیں چڑھا۔ اُس کے نام کا کوئی مذہبی مسلکی فرقہ تشکیل نہ دیا جاسکا۔ سرزمین اور انسانی معاشرے سے اُسے کاٹا نہ جاسکا۔ اور اُسے اشرافیہ کا ترجمان نہ بنایا جاسکا۔ شاہ کو معجزوں اور کرامتوں سے ہٹ کر دیکھنے والوں میں کمی نہ لائی جاسکی۔ شاہ کو اس کے سماجی اور عصری پس منظر میں دیکھنے والوں کی کمی نہ رہی۔ شکر، صد شکر!!۔

مگر یہ بھی سچ ہے کہ اُسے یوٹو پیائی فلاسفروں کی جماعت میں شامل کرنے سے بھی ہچکچانے کا چلن عام رہا۔ خود روشن فکر احباب واکابرین کے ہاتھوں بھی اسے بہر حال عقیدوی تقدس وتبرک کی چادروں میں لپیٹا گیا۔ چادریں خواہ وطن وقوم پرستی کی رہیں یا خالص سائنسی انداز کی 'آئیڈلزم کی بساند سے مبرا کبھی نہ رہیں۔ پیرا سائنسز اور سُوڈو سائنسز کو مسترد کرنے والوں کی طرف سے بھی شاہ کے ساتھ ایک طرح کا روحانی معاملہ ضرور رکھا گیا.....۔ شاہ کی تعلیمات میں روحانی مسرت ڈھونڈنا تو شرابی کی مسرت جیسی ہے۔ اور ہم سب سائنسی ریسرچ کا دعویٰ کرتے رہنے کے باوجود بن پیے اِس شراب کے نشے میں رہے ہیں۔ ہمیں اس خوف یا رومانویت سے اپنی رسی تڑوانی ہوگی۔ خوف، شاہ لطیف کے فلسفے کا سب سے بڑا دشمن ہے۔ بالخصوص شاہ لطیف سے خوف، اس کی کرامت کا خوف، اس کی ناراضگی کا خوف، اس کی

بددعا کا خوف.....محبت اور خوف ؟۔نہیں نہیں ، دونوں ساتھ کبھی نہیں رہ سکتے ۔ قاتل ہیں ایک دوسرے کے۔

یہ بات درست ہے کہ جب تک سماج میں محنت کرنے والا انسان زراعت سے وابستہ رہے گا شاہ لطیف کے ساتھ کرامت و تقدیر پرستی نتھی ہی رہیں گی ۔ایک صنعتی معاشرہ ہی اس قابل ہوتا ہے کہ فلاسفروں مفکروں کو تمام تر تعصّبات سے ہٹ کر جانچ سکے۔ یہ بھی صحیح ہے کہ فلاسفروں کے ساتھ زور زبردستی نہیں کی جاسکتی۔ایک مبہم اور نا ترقی یافتہ معاشرے میں جسمانی طور پر زندہ نہ رہنے والے مفکروں کی کلاسیفی کیشن Strict انداز میں کرنی بھی نہیں چاہیے۔ہم نے بھی نہ کی۔مگر ہم نے اس کی فکر کو ساکت و جامد عقیدہ بنائے جانے والوں سے الگ راہ اختیار کی۔عقیدوی تقدس کے بجائے فکر کی اس کے تازگی اور زمینیت کی بنیاد پہ اسے پرکھا، اُسے ولی کے بجائے فلاسفر کے بطور دیکھا۔ ہم نے اُس کے ساتھ اپنی وابستگی کی بے شمار فکری Commonalities دیکھیں۔

اور یہ سچ ہے کہ دیگر بے شمار یوٹوپیائی کمیونسٹوں کی طرح شاہ لطیف کے پیغام کا بڑا حصہ کئی صدیوں تک بنی نوع اِنسان کے لیے ریلیونٹ رہے گا۔

آخر میں بس ایک ہلکی پھلکی، مگر پُر معنی بات:

ایک قوم پرست بھٹائی کے روضے کے سامنے فریاد کر رہا تھا:

''جاگ بھٹائی، کہ سندھ بلا رہا ہے!''

اچانک بھٹائی کے مزار سے ایک ہاتھ نکلا اور اُسے لعنت بنا کر کامریڈ کے منہ پہ زور سے رگڑا اور کہا:

''اڑے لعنتی، میں نے اتنا بڑا ضخیم 'رسالہ' کن کے لیے لکھ چھوڑا ہے؟

''پڑھنے سے فرار، اور بس جاگ بھٹائی''۔

حوالہ جات

1- ٹالبوٹ، ایان۔ پاکستان اے نیو ہسٹری۔2012۔آکسفورڈ یونیورسٹی پریس۔صفحہ 41

Chittick, C. Willium. Sufism, Beginners Guides -One World (2) Oxford.2009. pp. 39

سماجی معاشرتی پس منظر

اگلا سوال ہمیں یہ کرنا ہوگا کہ شاہ لطیف کا زمانہ کون سا، اور کیا تھا جسے ابراہیم جویو نے ''سندھ کی روح، اُس کی زندگی کی سانس''(1) قرار دیا؟۔ کن معروضی معاشی سیاسی سماجی حالات میں یہ پودا اتنا بڑا اتنا ور درخت بن گیا کہ چار سو سال بعد بھی جید لوگ اس کی تعلیمات کی عظمت کے بارے میں بولتے لکھتے ہیں۔ اور اسے محض سندھ نہیں بلکہ پوری انسانیت کے غموں، دکھوں اور آرزوؤں کا ترجمان قرار دیتے ہیں۔

شاہ کا یہ زمانہ ستارھویں صدی کا اواخر اور اٹھارویں صدی کا اوائل تھا۔ سندھ کا ذکر اس لیے ضروری ہے کہ زمان، مکان کے ساتھ بڑا خصوصی لین دین کرتا ہے، اور اُسی کی مخصوصیات سے مل کر چلتا ہے۔ مکان نہ ہو تو زمان کا نسب ہوگا نہ شجرہ۔ وقت کی سوئیاں مقام کی دیوار پہ ٹھونکی ہوتی ہیں۔ اور شاہ کا مقام و مکان بنجر نہ تھا، اُس کے مکان و مقام کو تو جھوک نے محنت کرنے والوں کا بائبل بنا ڈالا تھا۔ شاہ لطیف کا شعوری زمانہ شاہ عنایت کی شہادت سے لے کر نادر شاہ کی سندھ پر یلغار تک کا ہے۔ مگر یہ بھی سوچنے فکر کرنے والا سچ ہے کہ اُس دور میں زندگی گزارنے والا ہر شخص شاہ لطیف نہیں بنا۔ ظاہر ہے کہ کچھ خاص موضوعی تبدیلیاں اُس کی سرشت میں گھڑی اور گڑی گئی ہوں گی، جنہوں نے اُسے بقیہ آبادی سے ابد تک ممتاز بنا دیا۔ آیئے ہم ذرا سا اُس انتظام کو دیکھ لیتے ہیں جس کے تحت اُس متجسس و شاہد روح کو وہ وجوہات و محرکات عطا ہوئیں جن سے وہ اپنے مشاہدہ کو تخلیق میں ڈھال سکا تھا۔

یہاں ایک بہت بڑا واقعہ ہوا جس نے نوجوان عبداللطیف کی زندگی کا رخ بدل دیا۔ واضح رہے کہ شاہ کی والدہ تو ایک دیہاتی گھریلو خاتون تھی مگر اس کا والد سید حبیب شاہ نہ صرف ایک عالم اور روحانی پیشوا تھا بلکہ وہ اپنے زمانے کا مشہور طبیب بھی تھا۔ دیکھو دیکھو، تماشا دیکھو کہ یہ طبیب اُس روز موجود نہ تھا جب بڑے جاگیردار کی بیٹی بیمار ہوئی تھی۔ لہٰذا پیر اور طبیب کے جواں سال بیٹے عبداللطیف کو مریضہ کے علاج اور دم چُھو کے لیے لے جایا گیا۔ وہیں تو اس کی بکھری فریکوئنسیز کو ایک نکتہ پر مجتمع ہونا تھا۔ قبلہ اور سمت متعین ہونے تھے۔ معروض کو موضوع کے فریم میں کلک ہونا تھا۔ چنانچہ عشق کے مقدس فرشتوں نے اُسے اپنی حفاظت میں لے لیا۔ مریضہ کا علاج تو خیر کیا ہونا تھا خود طبیب بیمار پڑ گیا۔ شاہ اُس فیوڈل کی بیٹی مریضہ پہ عاشق ہو گیا۔

مگر یہ تو فیوڈل کی توہین تھی ''تیری یہ جرأت؟''۔ نتیجہ یہ کہ نہ صرف لڑکی نہ ملی، بلکہ سزا کے طور پر خاندان کو گاؤں بدر کر دیا گیا۔ اور، یوں ریت کے ایک ٹیلے یعنی ''بھِٹ'' کو اپنا نام ''بھٹ شاہ'' میں بدلنا نصیب ہوا اور شاہ لطیف کو ''بھٹائی'' ہونا پڑا۔ مکان اور مکین دونوں وہ نہ رہے جو تھے، دونوں نے جون بدل دیے۔

زور والوں کی طرف سے یہ مسترد کردہ عاشق محبت کے ہیجان میں شاعر بنا۔ بھٹ شاہ کو تو بھٹ شاہ ہی ہونا تھا کہ وہ ذی روح نہ تھا۔ مگر عشق کا چھوا ہوا، مگر سماج کا مسترد کردہ شاہ ایک چوٹ کھایا بَل کھاتا ہوا برافروختہ نوجوان بن گیا۔ اُسے بے قراری نے، تڑپ نے، عشق نے کہیں ٹک کر بیٹھنے نہ دیا۔..... عشق کہیں کا نہیں چھوڑتا۔ یہ ایک ایسی قوتِ متحرکہ ہے کہ جامد و ساکت روح کی طرح جامد و ساکت سماج بھی لہروں کے تھپیڑوں کے نشانے پر آ جاتا ہے۔ جنگ کا میدان، گھر بن جاتا ہے اور گھر عشق کی عبرت کا نشان۔ ''بھٹ'' تو بس اِس افتان و خیزاں کے دوروں کے بیچ کی ایک سرائے تھی، یا پھر پی ایچ ڈی کے بعد ایک استاد کا مکتب۔ آسمانوں میں دکشا کی بیٹی ستی سے شیو کے عشق کا انجام بلوچستان نکلا، ہنگلاج نکلا۔ زمین پہ فیوڈل کی بیٹی سے لطیف کے عشق کا انجام سندھ نکلا، بھٹ شاہ نکلا۔

کہانی میں بس ایک بہت ہی غیر اہم ٹوئسٹ اُس وقت آیا جب، بعد میں شاہ کی محبوبہ کے

گھرانے پر مصائب کے پہاڑ ٹوٹے تو تواہمات کی ماری آبادی کے فیصلے کے تحت حاکم کی وہی بیٹی اُس کی زوجہ بن گئی۔

کمال یہ ہے کہ شاہ کو پہلے محبت ہوئی پھر وہی اُس کی بیگم بنی جب کہ عموماً سندھ و بلوچستان میں ایسا کم ہوتا ہے۔ یہاں تو کم سنی میں شادی ہوجاتی ہے اور بلوغت میں محبت۔

مگر اس بیچ بہت سا پانی پُلوں کے نیچے سے گزر چکا تھا۔ شاہ اب پرانا شاہ نہ رہا تھا۔ اُسے اب شہ مرید ہی کی طرح کسی ''برہنہ کندھے'' کو دیکھنے کی ضرورت نہ رہی تھی کہ اس کے ''بارہ کے بارہ بند'' دوڑ چکے تھے۔ جنس کی طبعی نوعیت بدل چکی تھی۔ کہ ''زالے توئے زالے مناں'' کا عمل مکمل ہو چکا تھا۔ اُس پر طرہ یہ کہ فطرت لطیف کو فراق کی بھٹی میں ہی جلاتے رہنے کا فیصلہ کر چکی تھی۔ چنانچہ اُس کی محبوبہ بیگم جلد ہی فوت ہوگئی۔

لوجی، شاہ کے مسافر پیروں کی واحد ممکنہ کھونٹی بھی اکھڑ گئی۔ نہ رہی رسی، نہ رہا بندھن۔ بس اب اُس کے ننگے پیر تھے اور سندھ، بلوچستان کے وسیع گرم ریگستان، درے، نالے اور کوہستان تھے۔ اجتماعِ ضدین کا جدلیاتی دائرہ مکمل ہوجاتا ہے تو کیفیتی تبدیلی برپا ہوجاتی ہے۔

شاہ اور اس کے جوگی

جی ہاں، عشق کی چوٹ کھائے اس عاشق کے مزاج میں اضطراب و بے قراری اس قدر بڑھی کہ وہ جنگلوں، پہاڑوں، صحراؤں اور ریگزاروں کی طرف نکل پڑا.....اکیلا نہیں، بلکہ بہت سی تجسس بھری روحوں کے ساتھ، بے قرار دماغوں کے ساتھ، مشاہدہ کے مشتاق سماجی سائنس دانوں کے ساتھ، زندگانی کی سختیوں کی فرسٹ ہینڈ معلومات چننے والوں کے ساتھ۔ یہ محروم و مجذوب شخص، علاقہ چھوڑ دیتا ہے اور ایسے لوگوں کا ہم سفر بن جاتا ہے جن کے پاس کہیں کے بھی ڈومیسائل نہیں تھے۔ ''ہر ملکِ خدا ملک ماست'' والے پورے کرۂ ارض کے باشندے۔ تکمیل یافتہ انسان۔ (مگر یاد رہے کہ یہ سہولت جائیداد والوں کو میسر نہیں ہے)۔

چنانچہ وہ بے جائیداد جوگیوں اور بنجاروں کے ساتھ پیدل، ننگے پیر، اور بغیر راشن و

بستر لیے چل چل کر حدتِ فراق کم کرنے کی کوشش کرتا رہا، اپنا غم دوسروں کے غموں سے جوڑتا رہا اور اِس مجموعۂ غم کو مشاہدہ اور تفکر کے ساتھ ملا کر اپنے تن من میں حلول کرتا ہوا آگے بڑھتا گیا۔

شاہ نے جن لوگوں کے ہمراہ یہ سفر کیے انہیں وہ ''جوگی'' کہتا ہے۔ دلچسپ بات دیکھیے کہ شاہ سے ایک آدھ صدی قبل ہمارا شہہ مرید بھی ایسے ہی لوگوں کے ساتھ طویل سفر کر چکا تھا۔ (شاہ اور شہہ .....کیا کیا مشترکات ہیں!!)۔ شہہ مرید انہیں جوگی کے بجائے ''پنخیر'' کہتا ہے۔ اس لیے میں اپنے بلوچ قارئین سے گزارش کرتا ہوں کہ وہ ''پنخیر'' اور ''پنڈوخ'' میں ہمیشہ فرق کیا کریں۔

شاہ کے جوگیوں پر بہت کام اور تحقیق کرنے کی ضرورت ہے۔ ویسے ہی کاغذوں کا پیٹ بھرنے کے لیے، نہیں بلکہ سنجیدگی سے۔ انہی جوگیوں (پنخیروں) سے ہم سندھ بلوچستان کی روح کو سمجھ سکتے ہیں۔ مہاتما لوگ تھے یہ۔ کسی بھی باقاعدہ اور منظّم دھرم سے قبل کی وہ شکل جہاں انسان فطرت کے ساتھ بہت دوستانہ تھا۔ ماقبل غلام داری اور قدیم کمیون عہد کا سرحدی زمانہ جہاں ظلم اس قدر بے لباس نہ تھا، جہاں انسان دوسرے انسان کے ہاتھوں بے توقیری اور لٹنے سے آشنا نہ تھا، اور جہاں ایک مبہم سی عالم گیر مساوات اور یک جہتی کی معطر فضا موجود تھی۔ ایسا عہد جہاں کسی طرح کی تبدیلی کیے بغیر آج بھی یورپ و ایشیا کے شہری علاقوں کے بے شعور باشندے جانا چاہتے ہیں، اور وہ بھی کسی سیاسی جدوجہد کے بغیر بے ثمر رقص، ہپی ازم والے فرار، اور ہرے راما ہرے کرشنا کے دھوئیں کے دوش اُس سنہرے دور میں شمولیت چاہتے ہیں۔ مگر اس علم کے بغیر، کہ سرمایہ داری کی ''گردن بُرنفسانفسی'' کا تختہ الٹے بغیر اب ایسا سماج ممکن نہیں۔ یہ بات دانش وروں کے ایک بڑے حصے کی سمجھ میں بھی نہیں آتی۔ وہ بے چارے بھی اِن چرس نوش عمل گزیدہ ناچیوں سے سماجی نجات کی امیدیں وابستہ کیے بیٹھے ہیں۔

شہ مرید اور شاہ نے اپنے کلام میں اپنے ''پنخیروں'' اور ''جوگیوں'' کا خوب تذکرہ کیا ہے۔ کہتے ہیں کہ شاہ نے اپنے جوگی رفیقوں کو تیس سے زیادہ القابات سے یاد کیا ہے۔(2)

شہ اور شاہ کے جوگیوں کو نیل کے ساحل سے غرض تھی اور نہ یہ کاشغر تک کی طالبانی شاہینی

کرتے تھے۔ یہ لوگ کسی بھی سپین اور دہلی پہ کوئی جھنڈا گاڑنے والی سپاہ نہ تھے۔اس لیے اے دوستو! انہیں لائٹ نہیں لینا چاہیے۔شاہ کے جوگی عالم تھے ،فرزانے تھے ، فلاسفر تھے .....وہ استثنائی افراد جنہوں نے کھوج وتحقیق ومشاہدہ کے لیے دنیاوی آسائشیں ٹھوکر کی زد میں رکھ دی تھیں۔ جن کی رفاقت میں کندن بنا جاتا ہے۔نعرے بازی سے دور،خودستائی سے پرے، نام ونمود سے ناآشنا، کسی بھی مذہبی ٹھیکے داری سے مبرا..... ''سیروفی الارض'' سے سیکھنے والے۔کوئی بڑا چھوٹا نہیں،کوئی مرید ومرشد نہیں۔ برابر کے ساتھی،ایک جیسے ہم سفر،ایک کاز کے کامریڈز۔

شاہ اپنے جوگیوں کے ساتھ بزرگوں ولیوں فلاسفروں کی زیارت کرتا رہا،خود کو فطرت کے ڈسپلن میں تربیت دلاتا اور فکر وتفکر کی عادت پختہ کرتا رہا۔اس نے اس کام میں بالکل وہی طریقہ اختیار کیا جو شہ مرید کا تھا۔ بلاشبہ شاہ کا ''جوگی'' اور شیہہ مرید کا ''پنجیر'' باہم گہری مماثلت رکھتے ہیں۔ یہ لوگ (صرف ستر ڈھانپے ہوئے)'' ننگ دھڑنگ لوگ ہیں، ملنگ، نیم مجذوب، غراتے ہوئے (مانگ کر) پیٹ بھرتے ہیں، درختوں کے تنے اُن کے بالشت ہیں' اُن کے گدّے ''کرکاوغ'' نامی جڑی بوٹیاں ہیں.....

شاہ کے جوگی ایک کاسہِ گدائی اپنے ساتھ رکھتے ہیں۔اس کے علاوہ ایک نرسنگھا، جو لکڑی یا سینگ کا بنا ہوتا ہے۔ جسے وہ کھانے سے قبل اور عبادات کے بعد بجاتے ہیں۔اور وہ ایک پھٹی پرانی گدڑی اپنے ساتھ رکھتے ہیں جس میں خیرات میں ملا ہوا کھانا رکھتے ہیں۔ یہ لوگ اپنے ساتھ ایک ڈنڈا بھی رکھتے ہیں۔شاہ کہتا ہے،'' ان میں کوئی عیب نہیں اور وہ دوبارہ گناہ گار نہیں ہوسکتے۔انہوں نے دنیاوی خواہشات کو ترک کردیا۔ وہ آرام پہ غلبہ حاصل کرلیتے ہیں۔ وہ دنیاوی راہوں سے کنارہ کش ہوجاتے ہیں۔ وہ رضا کارانہ طور پر صبر ویقین سے اپنے آپ کو ضبطِ نفس اور ریاضت کے ذریعہ منزہ کرنے کی جدوجہد کرتے ہیں۔مکروہاتِ دنیاوی فنا، دل میں محبت کی شمع روشن، قناعت سے بھرے لوگ۔ ایسے لوگ جن سے رنگ ونسل کی بابت کون پوچھ سکتا ہے۔انہیں کھانے کی خواہش نہیں ہوتی۔ وہ ریگستانوں میں گداگری کرتے ہیں،مگر گداگر نہیں ہوتے۔ وہ بھوک کو اپنے تھیلوں میں ڈال دیتے ہیں اور اس بھوک کا جشن مناتے ہیں۔ نہ ان کی کوئی خواہش ہوتی ہے

اور نہ وہ اشتہا محسوس کرتے ہیں۔ بلکہ وہ تو تشنگی کو نوش جان کرکے اپنی پیاس بجھاتے ہیں۔انہوں نے اپنی انا کو مسخر کرلیا ہے۔ان کے گھٹنے محراب ہیں۔ان کا جسم مسجد ہے۔ وہ اپنے قلب کو قبلہ قرار دے کر اس کے گرد طواف کرتے ہیں۔انہوں نے سچائی کی تکبیر کہی اور اپنے اجسام کو نظر انداز کردیا۔ گناہ کی ان کے سامنے کیا حیثیت ہے.....'' مکمل طور پر declass شدہ لوگ۔

دیکھا جائے تو یہ تو شاہ عنایت کی تحریک کے لیے بہت ہی موزوں سپاہی تھے،مگر شومیِ قسمت کہ یہ تحریک کچل دی گئی تھی اور ایک نئی منظّم تحریک ابھرنے کا وقت آیا نہ تھا۔لہٰذا مین سٹریم سے ہٹ کر،اور ایک سیاسی نظریہ سے خالی، ایک موہوم سی موضوعیت کا غلبہ انہیں ایک انقلابی ہونے سے الگ رکھتا ہے۔

سب سے بڑی زیارت گاہ: بلوچستان

لوگو،سندھ بے شک اس کی ماں جھولی تھا،اُس کا جنم بھومی، اور اس کا آبائی قبرستان تھا۔ مگر یہ بہت بڑی نعمت بھی اُس کے لیے کم پڑ گئی۔اُسے اور مواد کی ضرورت تھی۔اسے مزید تپسیا چاہیے تھے،مزید گرائنڈ ہونا تھا۔اور سب کو خبر ہو کہ تپسیا اور درشن کے اعلیٰ مقام کا نام ''بلوچستان'' ہے۔

شاہ نے سندھ اور مغربی وجنوبی بلوچستان کا چپہ چپہ پھر کر صداقتوں کو سمیٹ لیا۔شاہ لطیف چہار اطراف سفر در سفر کرتا رہا، ریفریش اور ریفائن ہونے۔شاہ لطیف اپنے اِن سفروں میں شمال میں بہاولپور اور ملتان تک گیا۔ وہ مغرب میں لسبیلہ اور ہنگلاج تک کو چھو گیا۔جنوب میں اُس نے سمندر کنارے چل چل کر ہر علاقہ کنگھال مارا۔کاٹھیاواڑ کا چپہ چپہ دیکھا۔(کہتے ہیں کہ اس نے اپنی 63 سالہ زندگی میں سے تقریباً 22 سال سیر وسیاحت میں گزارے)۔(3)

آیئے دیکھتے ہیں کہ کشش بھرا بلوچستان کس طرح اُسے اپنا گرویدہ بناتا ہے۔شاہ نے جوگیوں یوگیوں کے ساتھ اُن کا زرد لباس پہن کر چٹانی پہاڑوں کی رکاوٹیں پھلانگیں۔اور یوں وہ مندروں کے مندر،قدیم مندر،ہنگلاج کی زیارت پہ گیا تھا۔ہنگلاج کراچی سے 120 میل دور لسبیلہ میں واقع ہے۔ یہ مندر امبا، پاروتی، یا، ہنگولا دیوی سے منسوب ہے۔ہنگلاج زائرین کے

لیے ایک مقدس جگہ ہے جو ابتدا میں یونانیوں کے ہاں ''نانیا'' اور ہندوؤں میں ہنگلاج دیوی کہلاتا ہے۔ مسلمان بھی اس دیوی کو ''بی بی نانی'' کے بطور ہدیہ تبریک پیش کرتے ہیں جو یونانی دیوی نانیا سے گہری مشابہت کی حامل ہے۔

عام عقیدہ ہے کہ سیتا دیوی کا سر اس علاقے میں گر گیا تھا۔ اس لیے اُس زمانے سے یہ ایک زیارت گاہ بن چکا ہے۔ ایشیا کے ہر کونے سے ہر سال اپریل میں ہزاروں لوگ ہنگلاج ماتا مندر کی چار روزہ تقریبات منانے جمع ہوتے ہیں۔

بے لالچ لالچی لطیف ''مزید، مزید'' کے حصول کے لیے بلوچستان کے قدم چومتا رہا۔ بار بار اس کے طواف کرتا رہا۔ وہ اپنے زرد پوش ساتھیوں، نیم عریاں قیسوں کے ساتھ جلتے ریگزاروں اور تھکا ڈالنے والے نخلستانوں کو عبور کرتے ہوئے دریائے ہب اور پب پہاڑوں کے راستے سفر کرتا رہا۔ یہیں تو اسے سسی کا ترجمان بننا تھا۔ اس لیے کہ اُس سے بہت پہلے بھنبھور کی سسی اس دشوار علاقے کو عبور کر چکی تھی۔ شاہ نے اپنی آنکھوں سے اُن سارے مناظر' تکالیف اور رکاوٹوں کو دیکھا جو اِس عظیم ٹریجک ڈرامہ میں موجود تھے۔ یہی وہ پس منظر تھا کہ اس نے اپنے کلام کا اَسی فیصد سے بھی زیادہ حصہ سسی کے لیے وقف کیا۔ بلا شبہ سسی شاہ کی ترجمان ٹھہری، اور شاہ سسی کا پرچم بردار ہوا۔

اس نے جام لسبیلہ کے اہلکاروں کو زائرین سے ٹیکس لیتے کھاریرو نامی جگہ دیکھی، ہاڑو نامی دشوار گزار پہاڑی کو پیدل عبور کیا۔

کہتے ہیں کہ اس نے ننگے پیر، بغیر توشہ و سامان، اور طلبِ شعور میں دو بار اس زیارت گاہ کی زیارت کا سفر کیا تھا۔ (4)

شاہ نے منگھو پیر لسبیلہ کے شمال مشرق میں زہریلے سانپوں کی پھنکاروں کے بیچ سے کیر تھر سلسلہ کوہ کے ساتھ ''ونگار'' کے راستے لاہوت کا بھی سفر کیا۔ لاہوت کا مطلب بدھ لوگوں کے آخری منزل ''نروان'' کی طرح ''لاوجودی'' ہے۔ لاہوت پب کے پہاڑوں کے عین دل میں دشوار گزار علاقے میں واقع ہے۔ وہ لاہوت غار کی دشوار گزار اترائی اترا اور قطرہ قطرہ دودھ ٹپکاتی گائے کی تھن نما چٹانی ابھار کو دیکھا۔ لاہوت لامکاں کے سفر نے شاہ لطیف کو خوب متاثر کیا۔

لاہوت سے ذرا دور ایک درگاہ ہے جسے ''شاہ نورانی'' کہتے ہیں۔ ''لطیف جی مسیت'' اور ''لطیف جی کھوئی'' اور ''شاہ لطیف کی تیرتھ گاہ'' نامی مشہور مقامات آج بھی زائرین کی عبادت گاہیں ہیں۔

بلوچستان نے عبداللطیف کو مکمل طور پر اپنے سحر میں لے لیا۔ اس حد تک کہ اس نے تو اپنی سندھی شاعری میں باقاعدہ بلوچی الفاظ جگہ جگہ ڈال رکھے ہیں: شما واوشموش، گوش، رواں مروشی روش، گنداگُشی، مروشی جبلہ رواں ....۔

شاہ بہت میٹھا ہے کہ وہ سسی کے گلابی منہ سے گلابی بلوچی کے یہ الفاظ کہلواتا ہے: برو، پاذا، تانگورواں، چے شی، ایذابلّتی، پَرویشی، برو، کُشتغاں، تَھواو ماں، دئی، تَو دئی، دُراہ سکھیا دراھاں، رواں، روش مروشی، مناں گُشی مولدے، تَو گوئش، منی گوش، مروشی جیلہ رواں پگّھئ، ایذاانندوں، نشتغاں، اِشاں۔ (5)

بلوچستان کے نامور دانش ور و سیاسی کارکن شورش بابو کے رسالہ ''نوکیں دور'' کے 1968 کے ''شاہ لطیف'' نمبر میں محمد شفیع کپری بلوچ کی کاوش سے ہمیں اِن بلوچی الفاظ والے اشعار بھی ملے۔ ذرا ملاحظہ ہوں:

بُرو پھدابات جَن جیی تھانگوُں رواں تھئیشیں
ڈئن پارسیون پاٹ مَیں ایذ ابلوں ایشئَیں
لیٹرن رات لطیف چیئے نٹا کوئ نیشیں
پذ ہوں پرویشیں، کج پیادن جیی، پندھ میں

****

بروبگیر د بام بلیخاں کام پروڑے مام
تَو دیئ تھوٴ مناں خشتگاں کہ تو چھُلی پھیر جیی لام
اَجھے جنھیں سام دُرہادُرہا کن جیی

****

جیکر روں روش مروشی محبوب ڈے
مناں کُشی مولدی دیوان پنہوآ روش
تھئو گوخان منی گوش سٹّی مان سَگھی تھیان

****

پھدا پھیر یالئوں مہاروں مَیَن جوں
مروشی جبل رواں وائی واریاؤں
موں کھے ماروُں یاروچی پولی کرے

****

بروبگیر دبی ثاڈین پارسیوں پاٹ میں
موں لوڈائی لکھیا تہ ہانجو کنداہی
ماریندا موں کے پنہوں نیندا پاٹ ساں

(6)

سفر کی خصوصیات

دلچسپ بات یہ ہے کہ اس نے کبھی بھی جاگیرداروں، پیشواؤں، ولیوں اور حکمرانوں کے ساتھ کوئی سفر نہ کیا۔ اس نے ہمیشہ عام انسان سے رابطے رکھے۔ اس کا جوگ تو ڈارون کا ''بیگل کا Voyage'' تھا۔ پھرتا گیا، دیکھتا گیا، سیکھتا گیا، بیان کرتا رہا، سکھاتا رہا۔ سفر و حضر کی اِن پُرصعوبت گردشوں کے دوران اِس نوخیز سماجی سائنس دان کو جن بڑے انسانوں سے بالمشافہ ملنے یا اُن کی شخصیت کو جاننے کا موقع ملا، اُن کے اسمائے گرامی ملاحظہ ہوں: شاہ عنایت شہید، شاہ عنایت اللہ رضوی، مخدوم محمد معین ٹھٹھوی، مدن بھگت، مخدوم عبدالرحیم گروہری، سید محمد بقا لکیاری، مخدوم دین محمد سہوانی، فقیر صاحب ڈنو فاروقی، مخدوم محمد زمان لوواری، مخدم صابر ولہاری، سید شاہ میر شاہ، مخدوم محمد ہاشم ٹھٹھوی، اور مخدوم محمد۔ (سید، جی ایم: شاہ لطیف اینڈ ہز میسیج)۔

یہ اتنے بڑے عالم اور فلاسفر تھے کہ ان پر فرداً فرداً بہت کچھ لکھا گیا۔ علم کے اتنے بڑے دریچے اُس کے لیے وا کیے گئے تھے۔ ایسی عمدہ تربیت گاہ کا انتظام تھا۔!۔

اس کے علاوہ اس ذہین انسان کو مخدوم بلاول جیسے آزادی پسند پیشرو کے بارے میں تفصیلات میسر ہوئیں۔ قاضی کادن اور مخدوم محمد میران سے، جونپوری کی تعلیمات کی شد بد حاصل ہوئی۔ جونپوری مہدوی نکتہ نظر کا ایک بہت بڑا تبلیغی تھا۔ یہ بات واضح رہے کہ سندھ و ہند میں مہدوی تحریک کی قبولیت کے اصولوں میں ''دولت سے عدم رغبت'' سب سے اہم اصول تھا۔

اسی طرح کی جہاں نوردی میں اسے ارغون و مغل حکمرانی، اُن کے درباروں کے اندر کی سازشوں اور درباروں سے باہر عوام الناس کی ابتر حالت و مزاحمت اور غداروں ہیروؤں کے بارے میں معلومات لیں۔

پتہ نہیں مولانا روم کی مثنوی کس وقت اُس کے بغل جھولے میں مستقل جگہ پا گئی۔

سندھ کے قومی شاعر' شاہ لطیف کی توصیف میں مزید کسی بھی تمہیدی ابتدائیہ کی کوئی ضرورت نہیں، اس لیے آیئے صرف یہ بات دیکھیں کہ اُس نے اُس زمانے کی روایت سے ہٹ کر اپنے بلند افکار اور وسیع فلسفے کا اظہار فارسی میں نہیں کیا۔ بلکہ اُس نے بلوچی الفاظ سے نمکین کردہ سندھی زبان کو اپنایا۔ آپ سوچیں تو سہی کہ اتنے بڑے فلسفے اور ضخیم بیانیے کے لیے بے شمار استعارات، تشبیہات، علامتوں، تلمیحوں کی ضرورت پڑتی ہے۔ کلاسیکل اور فوک کہانیوں ضرب المثلوں کو استعمال کرنا ہوتا ہے۔ وہاں کے مشہور مقامات کے تذکرے کرنے ہوں گے، وہیں کے چرند پرند، مناظر، شجر و حجر کے حوالے دینے ہوں گے۔ آپ تصور کرلیں کہ زبان کو کتنی ترقی ہوئی ہوگی۔ لسانیات والے ساری عمر کی پٹواری گیری کرتے پھریں بھی شاہ کے اِس احسان کو نہ تو تول پائیں گے اور نہ ناپ سکیں گے۔ دوسرے لفظوں میں اُس کا ایک بڑا مقصد اپنے فکر و فلسفہ کو مکمل طور پر ''سندھیانا'' تھا۔ چنانچہ شاہ اور اس کے فلسفے کا سارا سماجی معاشرتی پس منظر سندھ ہی کا تھا۔

اس زمانے میں اُس منطقے کے اندر سیاہ جاگیرداری قائم تھی۔ یہاں کلہوڑوں کی مذہبی (تھیوکریٹک) ریاست قائم تھی۔ ہر طرح کی شخصی رائے رکھنا کفر تھا۔ اور حاکم طبقات سے مختلف

رائے رکھنا تو ایک بہت بڑی بدعت تھی۔ لوگوں کو زبردستی مذہب تبدیل کرنے پر مجبور کیا جاتا تھا۔ مگر، جیسا کہ ایسی ریاستوں میں ہوتا ہے، شاہ لطیف نے بڑے بڑے بزرگوں کے سجادہ نشینوں کو دولت جمع کرنے میں مصروف دیکھا، عیش وعشرت کی زندگی گزارتے دیکھا، سؤر کا شکار کتے سے کرتے دیکھا، جاہ وحشمت بڑھاتے دیکھا۔ اس نے اِن بڑے انسانوں کے مزاروں پر اِن سجادہ نشینوں کی پشت پناہی میں بھنگ نوشی، جوابازی اور قحبہ گیری چلتے دیکھی۔ اِن سجادہ نشینوں کے ہاتھ اور پھر پیر چومے جانے کے قبیح مناظر دیکھے۔

شاہ لطیف نے اپنے سماج کو دو واضح طبقات میں منقسم دیکھا۔ ایک طرف فیوڈل تھے جنہیں وڈیرہ، ارباب، جام وغیرہ کہا جاتا تھا اور دوسری طرف محنت کرنے والے کسان تھے۔ فیوڈل' کسانوں کی کمائی پر شراب وبھنگ وشباب وکباب کی محفلوں کے مالک ہوا کرتے تھے، وہ بٹیر بازی چکور بازی مرغ بازی اور کتے اور بچھ کی لڑائی میں غرق تھے۔ ملاّ اور پیر اُن فیوڈلوں کے دستر خوان کے شریک تھے۔ فیوڈل عوام کو لڑاتا تو ملاّ اُن کی صلح کروادیتا مگر ملاّ فرقہ کی بنیاد پر جب عوام کو لڑاتا تو یہ وقتی اور معمولی لڑائی نہ ہوتی۔ شیعہ، سنی، مالکی، شافعی کے نام پر نفرتیں گہری ہوتی رہیں۔ سارا سارا سال قبروں کی حیثیت کے تعین پر بحثیں چلتیں۔ بلائیں' کالے بیل کی قربانی سے دور کرائی جاتیں۔ ایک سے زیادہ شادیوں کے جواز گھڑے جاتے۔

شاہ نے طبقات کو کیا خوب بیان فرمایا:

''صحت مند کو کیا خبر بیمار کی حالت!''

جاگیردار کا اتحادی ملاّ تھا۔ اس نے اپنے آقاؤں سے ایسے سخت ضوابط بنوائے جن کے تحت گیتوں اور موسیقی پر پابندی تھی۔ (مگر یہ ضوابط خود آقاؤں کے لیے نہ تھے)۔

جیسا کہ ہم ذکر کر چکے ہیں کہ ''جوگی پن'' میں شاہ کو عام انسانوں سے آزادانہ میل جول نصیب ہوا۔ وہ بے شمار سفروں میں عام لوگوں سے ملا، اُن کو قریب سے دیکھا، اُن کے دکھوں اور محرومیوں کو محسوس کیا۔ اس نے عام خلقِ خدا کی زندگیوں، روایات، رسوم ورواج، حالات واحساسات کو بہت قریب سے دیکھا۔ اُن سے مقبول ترین کہانیاں، روایتیں، داستانیں اور ہیروؤں

کے کارنامے سنے.....شاعری میں بھی اور قصے کہانیوں کی شکل میں بھی۔ اس نے ان کے سیاسی، سماجی اور معاشی صورت احوال کا تجزیہ کیا۔

عام سے خانہ بدوش اور کسانوں کی سادگی اور عادتوں نے لگتا ہے اس کا دل جیت لیا تھا۔ اس نے ان کے دکھ درد دیکھے، ان کی کمیوں، کمزوریوں کو بھانپ لیا، اُن میں موجود عظیم توانائی کی ناپ تول کی، اُن کے ماضی حال اور مستقبل پہ فکر کیا۔ ان ساری باتوں کا ایک لفظ بنتا ہے، شعور۔ شاہ نے اپنے عصر کا شعور حاصل کر لیا۔

یہی وجہ ہے کہ اسے پڑھتے ہوئے آپ بے ساختہ کہیں گے کہ شاہ تو مشاہدہ کا شاعر ہے۔ اپنے عمیق وہ مشاہدہ کو جمالیاتی چادر اوڑھا کر آفاقی بنا دیتا ہے۔ عام زندگی کے مشاہدات، چرواہے کے، کسان کے، چکی پیسنے والی عورت کے.....شاہ دیہی زندگی کی عام باتوں کو زبان دینے والا شاعر ہے۔

وہ تو ایسی ایسی مثالیں دیتا ہے کہ یونیورسٹیوں کے فلاسفروں کے نظریات ہاتھ باندھ کر تعظیماً سر جھکا جائیں:

سوئی کی عظمت و بادشاہی سے تو میں مقابلہ نہیں کر سکتا،
جو خود ننگی رہ کر دوسروں کے تن کو ڈھانپتی ہے،
تمہیں اس وصف کو سمجھنے کے لیے دوسرا جنم لینا پڑے گا!

اولمپک مشعل لطیف کے ہاتھ

شاہ لطیف سماجی دانش ور تھا۔ وہ سماج میں موجود غلط روایات کے خلاف تھا۔ اس کے کلام میں جگہ جگہ سماجی تبدیلی کی خواہش موجود ہے۔

شاہ کے منہ سے عشق کی راہ میں درپیش جدوجہد کو اِس گہرائی اور شدت سے بیان کرنا سمجھ میں آتا ہے۔ جی ایم سید نے حساب لگا کر بتایا کہ اِس خطے کے سب سے بڑے انقلابی، شاہ عنایت کا میران پور اُس جگہ سے ڈیڑھ میل کے فاصلے پر تھا جہاں شاہ لطیف کا دادا شاہ عبدالکریم دفن

تھا۔اور شاہ لطیف اکثر وہاں جایا کرتا تھا۔اس طرح اُسے شاہ عنایت سے ملنے کے کئی بار مواقع ملے تھے ۔اور وہ اس کی تعلیمات سے متاثر تھا۔چنانچہ لطیف نے نجاتِ آدم کا پرچم اُس وقت بلند کیا جب بادشاہوں، جاگیرداروں ، ملاؤں اور پیروں کے خلاف شاہ عنایت کی مضبوط ومقبول عوامی تحریک حال ہی میں کچل دی گئی تھی۔ایک ہاتھ سے پرچم ابھی گرا بھی نہ تھا کہ دوسرے ہاتھ نے وہ پرچم تھام لیا۔

دوسرے لفظوں میں سسی پنہوں کا خالق،تخلیق کے طویل اور تکلیف دہِ دردِزہ میں اُس وقت مبتلا تھا جب قریبی علاقے جھوک میں ایک بہت بڑی ولادت ہوچکی تھی۔ طبقاتی جنگ میں جب24 ہزار کسانوں کی شہادت ہوئی تو ہمارا یہ تخلیق کار اچھا خاصا باشعور آدمی تھا۔عوامی جدوجہد کے اِس عظیم الشان پس منظر میں اُس جی نیئس سے سسی پنہوں جیسی بڑی تخلیق ہی کی توقع ہوسکتی تھی۔

اور جب جھوک کی کسان تحریک لڑی گئی اور 24 ہزار مردوزن کسان کی شہادت کے ساتھ شاہ عنایت کو بھی تہہ تیغ کیا گیا تو29 سالہ شاہ لطیف لرز کر رہ گیا:

تمہاری زلفوں کے سبب قتل ہوئے ہیں؛اس کا کفن نہیں ہوتا،
کیوں کہ وہ شہید ہے اور اسے اپنی شہادت پر فخر کرنا چاہیے،
خوشی میں جھومنا چاہیے

ایک اور جگہ وہ یوں کہتا ہے:

مقصد کی راہ میں جو مر جاتے ہیں،
وہ بڑے خوش قسمت ہوتے ہیں

یا.....

سب کے سب اُس (خدا) کی موجودگی میں واحد معبود
(خدا) کی توصیف میں وارفتگی مصروف ہیں
تم کتنوں کو قتل کرنے کے قابل ہو؟!

شاہ کو اپنے مورچے کے ساتھیوں کا قتل کس قدر جھنجھوڑ ڈالتا ہے:

کوئی سچ کی جستجو کی آواز کو اُن کے ڈیرے سے نہیں سن سکتا،
وہ کہاں چلے گئے؟!
اُن کے خالی مزار میرا دل کھائے جا رہے ہیں،
وہ جو دلوں کو دوبارہ زندہ کیا کرتے تھے،ابدیت کو کوچ کر گئے!

شاہ نے عوام کے غموں کو شاعری کی زبان دے کر دنیا بھر میں شاہ عنایت کی جدوجہد کو جواز بخشا۔شاہ نے پسے ہوئے مظلوم کسانوں کے لیے آواز بلند کی۔اُس نے دیہات کی فراموش کردہ آبادی کا نوحہ گایا۔ تنگ دست ہاریوں اور بیگار میں پستے محنت کش کی جھونپڑیاں دکھائیں، خانہ بدوش چرواہوں، اونٹ چلانے والے ناقہ بانوں، دریاؤں میں جال ڈالے ماہی گیروں، مانجھیوں کو بیان کیا۔اُس نے ملاحوں کے گیت لکھے..... بنجاروں،کمہاروں، دھوبیوں، رنگ ریزوں، راگیوں، بیراگیوں اور دیگر افتادگانِ خاک کو عزیز رکھا۔یوں شاہ نے مراعات یافتہ سادات ،صوفیوں،قلندروں،اور جاگیرداروں پر مشتمل طبقے سے خود کو جدا کر دیا جو کہ شاہ عنایت کو شہید کرنے کے ذمہ دار تھے۔ چہارا طراف جاگیرداروں کی رہزنیاں تھیں، دست درازیاں اور مظالم تھے۔ ہر جاگیردار ایک چھوٹی سی سلطنت لیے جبر کا راج قائم کیے ہوئے تھا۔کوئی شانت شانتی نہ تھی۔وار لارڈز آپس میں گتھم گتھا رہتے تھے۔مخلوقِ خدا پہ ظلم کرنے والے یہ جاگیردار ہتھیار کے بطور پنڈتوں، ملاؤں اور پیروں کا استعمال کرتے تھے۔(7)

مقامی جاگیردار،چوں کہ دہلی میں بیٹھے ہوئے بادشاہ کی اتجنٹی کرتے تھے،اس لیے وہ ان پیشواؤں کے ذریعے دہلی کے بادشاہ کو خدا کا سایہ قرار دلوا دیتے تھے اور اِن ملاؤں کے بقول، بادشاہ کی نافرمانی خدا کی نافرمانی کے برابر ہے، بادشاہ سات اولیا کے برابر ہوتا ہے ۔ وہ قدرتی آفتوں بیماریوں کو بادشاہ کی نافرمانی کی وجہ سے خدا کا قہر قرار دیتے تھے۔

حوالہ جات

1- جویو، ابراہیم شاہ لطیف.....عظیم شاعر اور سماجی مصلح۔The Betryal۔جلد 2۔2005۔
سندھی ادبین جی سہکاری سنگت۔صفحہ 110

2۔ سید، درشہوار/ نقوی خلیل ابراہیم۔ شاہ لطیف شاعری اور فکر۔1994۔ کراچی یونیورسٹی
صفحہ 104

3- بروہی، علی احمد، شاہ عبدالطیف بھٹائی۔ کتاب'' شاہ عبدالطیف ہز مسٹکل پوئٹری۔1991۔شاہ
کلچرل سنٹر۔صفحہ 227

4- بروہی، علی احمد، شاہ عبدالطیف بھٹائی۔ کتاب'' شاہ عبدالطیف ہنر مسٹکل پوئٹری۔1991۔شاہ
کلچرل سنٹر۔صفحہ 227

5۔لالوانی، لیلا رام وطن مل شاہ لطیف سنگ میل پبلی کیشنز لاہور۔1977 صفحہ 95-90

6۔محمد شفیع پندرہ روزہ نوکیں دور۔کوئٹہ۔23 مارچ 1968۔صفحہ 3

7۔فہمیدہ حسین۔حضرت شاہ عبداطیف بھٹائی۔2008۔اکیڈمی ادبیات اسلام آباد۔صفحہ 54

شاہ لطیف، سندھی کلاسیک کا بیٹا

ادب کی دنیا میں خلیل جبران، شیخ سعدی، مولانا روم اور ڈی میلو کی تمثیلی اخلاقی کہانیاں بہت مقبول ہیں۔ کہیں دیکھیے تو شیر اور لومڑی کی کہانی ہے، کہیں طوطا اور تاجر کی.....وہ عام فہم اور چھوٹی چھوٹی کہانیاں اس لیے مقبول ہیں کہ وہ ایک سبق دیتی ہیں۔

شاہ لطیف بھی کچھ ایسے ہی رنگین قصے بیان کرتا ہے۔مگر یہ قصے وہ خود نہیں بناتا بلکہ وہ انہیں اپنے خطے کے کلاسیک سے چنتا ہے.....سسی پنوں، مومل میندھرو، نوری جام، لیلا چنیسر.....اس کی دوسری بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ یہ قصہ پورا نہیں کرتا بلکہ عموماً اُس کا سبق آموز حصہ بیان کرتا ہے۔(1)

شاہ لطیف تصور سے بھی بڑا دانش ور اور عظیم شاعر ہے۔اس لیے کہ اس نے بڑی سماجی تبدیلی کو اپنی تعلیمات کے ابلاغ کے لیے ایک بہت بڑا ائیر پورٹ، ایک بڑا براڈ کاسٹنگ ہاؤس اور ایک عظیم الشان و مضبوط فائٹنگ گراؤنڈ منتخب کر لیا۔اور وہ زمین تھی، مقامی قومی سندھی تہذیب اور لوک کہانیوں اور سندھ سرائیکی پنجاب و بلوچ مشترکہ کلاسیکل داستانوں کی زمین۔شاہ نے اس مضبوط زمین پر پیر جمائے رکھنے کا فیصلہ کیا۔

کلاسیک نے نہ صرف شاہ کو اپنے ماضی اور کلچر سے جوڑ دیا بلکہ ذخیرۂ الفاظ، استعارات اور تشبیہات کے بیش بہا اور رنگین ہار اُس کے ذہن کے ذخیرے کے گلے میں ڈال دیے۔اِن اجرکوں، لنگیوں سے ملبوس اِس تازہ دم نوجوان نے اپنے ادب و زبان میں جمالیات اور فنی اقدار کو

نئے انداز سے شامل کر کے مالا مال کر دیا۔ پھر اس نے اپنے پیغام میں ماضی کی ثقافتی اور جمالیاتی روایت سے رنگ، ذائقہ، سونف، الائچی شامل کر دیے۔

جو شخص اپنی زبان کی کلاسیک پہ عبور نہیں رکھتا، وہ بس ''ہوائی'' آدمی ہوتا ہے۔ عوام کے ادبی ثقافتی شعور کی جڑیں تو اُس کی کلاسیک میں ہوتی ہیں۔ اور بالخصوص کلاسیک کا تقدس اور اس کی دولت مندی یہ ہے کہ یہ اساطیری ہے، اور اس میں مائتھالوجی ہے۔ بدقسمت اور مفلس ہیں وہ زبانیں جن کے پاس یہ اشرف انسانی خزانہ موجود نہیں ہوتا۔ ضیاء الحق ہیں وہ لوگ جو اپنی کلاسیک سے منہ موڑ لیتے ہیں۔

شاہ لطیف قسمت کا دھنی تھا۔ وہ سندھی کلاسیک کا دلدادہ تھا۔ اُس نے انہی کلاسیکل داستانوں کے کرداروں کو ازسرِنو دریافت کرنا، انہیں ازسرنو بیان کرنا، اُن کی جدوجہد کے اہداف و مقاصد کو واضح کرنا اور پھر جدوجہد کے دوران انہیں درپیش مشکلات ومصائب کو بیان کرنا اپنا مقصدِ حیات بنالیا۔

شاہ لطیف بہت بڑا فن کار اور بہت بڑا آرٹسٹ ہے۔ کلاسیک کے ساتھ سلوک کا شاہ لطیف کا طرز بھی بہت عجیب ہے۔ وہ بہت مقبول اور عام انسان کی جانی پہچانی کلاسیکل داستان کی مکمل کہانی بیان نہیں کرتا۔ بلکہ وہ اس داستان میں سے جدوجہد، اور بھی عورت کی جدوجہد کے ٹکڑے الگ کر کے انہیں اپنے رنگ میں بیان کرتا ہے۔

شاہ نے کلاسیکل داستانوں کی جست کو نہ صرف جدید و دل نشیں انداز میں بیان کیا بلکہ اُس نے ان داستانوں اور خود اپنے زمانے کے اردگرد موجود معروض کو تفصیل سے بیان کیا، اور معروض وموضوع کے باہمی عمل کے منطقی انجام کی تجزیاتی مستقبل بینی کر دی۔ اور اس نے فطرت کی حسین ترین منظر کشی کرتے ہوئے ایسا کیا۔ منظر کش شاعر و پس منظر کش فلسفی.....

شاہ سپاٹ قصہ بیان نہیں کرتا۔ وہ اِس قصہ میں سے حرکت و توانائی کے ٹکڑے ڈھونڈ نکالتا ہے اور تفصیل سے اُن ٹکڑوں کی منظر کشی کرتا ہے۔.....وہ ایک ہی نتیجہ نکالتا ہے (جو کہ اس کے سارے فلسفہ کا نچوڑ بھی ہے):.....''اول آخر چلتے رہنا ہے''۔

دنیا کی ہر زبان صرف دو جوہات کی بنا پر مقدس ہوتی ہے؛ ایک تو یہ کہ وہ اشرف المخلوقات کے ایک حصے کی زبان ہوتی ہے۔ اور دوسری یہ کہ وہ آفاقی افکار کے ابلاغ کا میڈیم ہوتی ہے۔ عوام زبان کو غنی بناتے رہتے ہیں اور افکار زبان کو بلند معیار اور وسعت عطا کرتے رہتے ہیں۔ یہاں، کتنی مزیدار بات ہے کہ نہ تو شاہ کے افکار نے سندھی زبان کو بہت تکلیف دی اور نہ سندھی زبان نے شاہ کے افکار کو جذب وٹرانسمنٹ کرنے میں کوئی تکلیف محسوس کی۔ سندھی زبان نے شاہ کی معراج کو اوج کی بلندی پر پہنچایا اور افکارِ شاہ نے سندھی کو غنی بنایا، اُسے بلند مرتبہ عطا کیا، اسے ایک بقا، ایک دوام، ایک حیاتِ جاوداں بخشی۔ زبان وافکار یوں گھل مل گئے کہ اُن کو الگ کرنا ناممکن ہوگیا۔ سندھی زبان کا نام شاہ لطیف ہے اور شاہ لطیف ہی سندھی زبان ہے۔

شاہ ایک عالم تھا۔ سندھی، عربی، فارسی، ہندی، بلوچی براہوئی، اور سرائیکی زبانوں کی شدبد کے سبب اس کی شاعری بہت وسیع، بہت عمیق اور رنگا رنگ ہوگئی۔ (مگر مست توکلی تو بلوچی کے علاوہ کچھ بھی نہ جانتا تھا۔ اُس کی شاعری بھی بہت وسیع، بہت عمیق اور رنگا رنگ تھی!۔ کون عشق کی رحمتوں کے لیے کلیہ قوانین بنا سکا ہے!!)۔

فولکلور، فوک کہانیاں اور فوک شاعری شاہ کی مریدنیاں تھیں۔ اُس کا مجموعہ کلام ''شاہ جو رسالو'' اس مزاج وعادت کا مکمل مظہر ہے جس کے گرد سندھ و بلوچستان کے اذہان گردش کرتے ہیں۔ ''شاہ جو رسالو'' ہماری نفسیات کے عین مطابق ہے، اور ہماری ضروریات کے بھی۔ یہ ایک ایسا دستور العمل ہے جو عوام الناس کو عمل کی ترغیب دیتا ہے، اُسے منظّم کرتا ہے اور اسے متحد کرتا ہے۔ یہ کتاب ہماری قدروں، معیاروں، امیدوں، خوفوں، تعریفوں، اور پسند ناپسند کا احاطہ کرتی ہے۔

شاہ لطیف نے سندھ کی تاریخی، نیم تاریخی اور فوک کہانیوں سے کام لیا ہے۔ کہانیاں یوں ہیں:

1۔ سونہڑیں میہر

2۔ سسی پنوں

3۔ سورٹھ رائے ڈیاچ

4۔ لیلاں چنیسر

5۔نوری جام تماچی

6۔موہل رانڑو

7۔مورڑو اور شارک

8۔عمر ماروی

ہر داستان کی طرح شاہ کی بیان کردہ کلاسیکی داستانوں بھی میں تنوع بہت ہے۔ ہر جغرافیائی علاقے میں اِن کا ورژن اَور ہو جاتا ہے۔ میں اُس بھول بھلیوں سے بچنے کے لیے اُسی وژرن پہ اکتفا کرتا ہوں جو شیخ ایاز، اور درشہوار کی کتابوں میں بیان ہوا ہے، یا جسے سوبھو گیا نچندانی، ابراہیم جویو، ڈاکٹر فہمیدہ حسین، یوسف سندھی اور ننگر چنا کی زبانی میرے کانوں نے چُنا ہے۔.....''سسی پنوں'' تو خیر، میرے جینز میں شامل ہے۔

میں اپنے غیر سندھی قارئین کے لئے کلاسیک کے اِن نمونوں کو یہاں مختصراً بیان کرتا ہوں۔

سونہڑیں میہر

وسطی ایشیا کا ایک امیر نوجوان سوداگر اِس خطے میں آیا (ہماری کہانیوں میں سارے سوداگر وسطی ایشیا سے ہی آتے ہیں!!)۔ اس نے نوکر کو کمہار سے کچھ خوب صورت برتن خرید نے روانہ کیا۔ نوکر کمہار کی بیٹی سونہڑیں کی تعریفوں کے ساتھ واپس آیا۔ نوجوان سوداگر برتن خرید نے کے بہانے خود سونہڑیں کے باپ کی دکان گیا۔ سونہڑیں کو دیکھا تو خرید کے بجائے فروخت ہوا۔ روح وہیں بیچ آیا۔ اب، وہ روزانہ برتن خرید نے کے بہانے اس کی دید کی بھیک دل کے کچکول میں ڈال کر لوٹتا۔ برتن ختم نہ ہوئے مگر پیسہ ختم، اور کمہار کا مقروض یہ سوداگر بالآخر اُسی کے ہاں نوکر ہو گیا۔ کمہار نے اُسے اپنی بھینسوں کی نگہداشت پر لگا دیا۔ اسی لیے تو یہ نوجوان میہر یا میہی وال کے نام سے مشہور ہوا۔ اور بعد میں ''ی'' گم ہوا اور مہی وال یعنی مہیوال رہ گیا۔ بالکل اُسی طرح جس طرح سونہڑیں کا ''ن'' اور ''ڑ'' کاٹ کر اُسے سوہنی بنا دیا گیا۔ ذرا دیکھیے تو سونہڑیں کو سوہنی بنا کر لفظ کا بھاری پن اور معنویت کس قدر کم ہو گئے۔ الفاظ میں حروف کا کردار بہت اہم ہوتا ہے۔

ایک لاابالی سوداگر کو ''میہی وال'' بنانے والی سونہڑیں نے کب تک بچ کے رہنا تھا۔ چنانچہ، عشق کے مدہم سروں نے اس کے رقصاں پیروں کی جواں چاپ بھی اپنی سمت کھینچ لیا۔ اِسے ''کچھ نہیں'' سے ''سب کچھ'' کی نعمت بھری وادی میں داخلے کی سعادت نصیب ہوئی۔

اور اب کیا ہونا تھا؟۔ وہ دونوں چھپ چھپ کے ملنے لگے۔ سونہڑیں کے باپ کو پتہ چل جاتا ہے۔ اس نے میہی وال کو ملازمت سے فارغ کر دیا، اور سونہڑیں کو کسی اور سے شادی کے نام پہ ڈسپوز آف کر دیا۔ مگر ایسا کیسے ہو گا رے؟۔ چنانچہ دو دلوں نے بلند آواز سے کہا ''ریجیکٹ!''۔ میہی وال بنا جوگی اور دریا کے اُس پار سونہڑیں کے گاؤں کے مقابل بس گیا۔ یوں شبینہ ملاقاتیں جاری کہ سونہڑیں ہر رات گھڑے کے سہارے دریا عبور کر کے آتی۔

مگر تا بہ کئے؟۔ یہ راز بھی معلوم ہونا ہی تھا ہو گیا۔ رات کی تاریکی میں اُس بے چاری عشق زدہ کے پکے گھڑے کو بدل کر ایک کچا گھڑا رکھ دیا گیا (جو آگ میں جل کر پکا نہیں ہوا تھا)۔ اس ہلاکت خیز سازش سے بے خبر سونہڑیں کچے گھڑے کو حسبِ معمول والا پکا گھڑا سمجھ کر اُس کے سہارے تھوڑی ہی دور گئی تو کچا گھڑا پانی میں حل ہو کر ٹوٹ گیا.....سونہڑیں ہاتھ پاؤں مار مار کر تھک گئی۔ ڈوبنے لگی تو مدد کے لیے چیخی۔ میہی وال پانی میں کود گیا، سونہڑیں نے آخری سانسیں اس کی بانہوں میں لیں، دونوں وہیں ڈوب کے مر گئے۔

شاہ لطیف نے اس کلاسیک کو اپنے استعاروں، تبصروں، اور نتیجوں کے ساتھ اپنی آفاقی شاعری میں شامل کر دیا اور ڈوبے ہوؤں کو دوبارہ زندہ کر دیا۔ شاہ نے بہت سے ڈوبے ہوؤں کے ساتھ ایسا کیا۔ شاہ بہت سے ڈوبے ہوؤں کے ساتھ ایسا کرتا رہے گا۔

سورٹھ رائے ڈیاچ

ریاست جونا گڑھ کے راجہ ڈیاچ کی بے اولاد بہن نے ایک بزرگ سے نرینہ اولاد ہونے کی دعا کروائی تو بزرگ نے بتایا کہ ایسا ہو گا تو سہی، مگر تمہارا وہ بیٹا بڑا ہو کر تمہارے اپنے بھائی کو قتل کر ڈالے گا۔

جب لڑکا پیدا ہوا تو اولاد کے لئے ترستی بہن نے بھائی کی جان بچانے کی خاطر انوکھی قربانی دی۔ اُس نے اپنے بچے کو لکڑی کے صندوق میں ڈال کر دریا میں بہا دیا۔ (دلچسپ بات دیکھیے کہ دریاؤں کی سرزمین کی کلاسیک میں دریا بردی کس قدر زیادہ ہے۔)

انّی رائے کی ساتھ والی ریاست کا ایک گلوکار اس بچے کو اپنا بیٹا بنا لیتا ہے اور بجل نام رکھتا ہے۔

تربیت پا کر، بجل بڑا ہو کر ایسا موسیقار بنا کہ اُس کی شہرت دور دور تک پھیل گئی۔

اِدھر بجل کی پیدائش کے وقت ہی اِس ریاست کے راجہ انی رائے کی بیوی نے آٹھویں بیٹی کو جنم دیا تھا۔ اُسے صندوق میں رکھ کر دریا برد کیا گیا۔ وہ بچی رائے ڈیاچ کی ریاست کے لاولد کمہار کے ہاتھ لگی۔ جس نے بیٹی بنا کر اسے پالا۔ سورٹھ نام رکھا۔ وہ بڑی ہو کر بلا کی حسین نکلی۔

اِس کے حسن کی شہرت اس کے اپنے باپ انی رائے نے بھی سنی اور اس بات سے بے خبر کہ وہ اس کی اپنی بیٹی تھی اُس سے شادی کا فیصلہ کر لیا۔ مگر ادھر رائے ڈیاچ بھی اس سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ کمہار دوسری ریاست کے راجہ کے بجائے اپنی ہی ریاست کے راجہ ڈیاچ سے بیٹی بیاہنے پر راضی ہو گیا۔ جس پر راجہ انی رقابت میں آ کر جونا گڑھ پر حملہ کرتا ہے۔ ایک سال محاصرہ رکھنے کے بعد بھی وہ کامیاب نہ ہوا۔ تب واپسی پر اس نے اعلان کیا کہ جو ڈیاچ کا سر کاٹ کر لائے گا اشرفیوں سے بھری طشت انعام پائے گا۔

پتہ ہے کو ن تیا ر ہوا اس کام کے لیے ؟ جی ہاں، بجل تیار ہو گیا۔ ڈیاچ کا اپنا بھانجا بجل۔ یہ عمدہ موسیقار بجل جب ڈیاچ کے محل کے قریب آیا تو موسیقی سے ڈیاچ کی بے پناہ رغبت سے باخبر بجل نے ایسی خوب صورت موسیقی بجائی کہ راجہ نے سونا، جواہرات، حتیٰ کہ اپنی مملکت اُسے پیش کر دی۔ مگر بجل نے سخی راجہ کا ہر انعام ٹھکرا دیا۔ راجہ تو موسیقی سے مسحور ہر چیز اُسے دینے پر آمادہ تھا۔ بجل نے اُس سخی سے اُس کا سر مانگا۔ موسیقی پہ عاشق سخی راجہ نے خود اپنی تلوار سے اپنا سر قلم کر دیا۔

مگر، وہ سر اُسے نہ انعام دلوا سکا نہ عزت۔ بلکہ راجہ انی رائے نے الٹا اُسے اپنی ریاست

سے بھی جلا وطن کر دیا۔ ریاست بدر بجل تیزی سے واپس جونا گڑھ پہنچا تو دیکھا کہ اس کے قتل کردہ راجہ ڈیاچ سے منسوب سورٹھ ستّی ہو رہی تھی۔ اپنے کیے پر پشیمان بجل اُسی آگ میں کودا' اور سورٹھ کے ساتھ جل کر اپنی زندگی ختم کی۔

لِیلاں چنیسر

دیبل کے راجہ چنیسر کی خوب صورت رانی، لیلاں ہیرے جواہرات کی بڑی شائق تھی۔ راجہ اس سے بے پناہ پیار کرتا تھا۔ اُدھر لکھپت کے راجہ کنگھار اور رانی مرکھی کی واحد اولاد اُن کی حسین و جمیل مگر بگڑی بیٹی کونرو تھی جسے اپنے حسن پہ بہت ناز تھا۔ وہ اپنی ہم زاد ''اتھادی'' سے منسوب تھی۔ اتھادی کی بہن اور کونرو کی سہیلی جمنّی نے اس کے طرزِ عمل پر طنز کرتے ہوئے کہا کہ اُس کے انداز سے لگتا ہے جیسے وہ اتھادی سے نہیں بلکہ راجہ چنیسر کی ملکہ بننے والی ہو۔ خود سر کونرو نے اس طعنے کا برا منایا اور عہد کیا کہ یا تو وہ چنیسر کی ملکہ بن کر دکھائے گی یا پھر مر جائے گی۔

والدین پریشان، اس لیے کہ شادی شدہ چنیسر اپنی رانی لیلاں سے بے حد محبت کرتا ہے۔ مگر وہ اپنی بیٹی کو مرتا بھی نہیں دیکھ سکتے تھے۔ چنانچہ ماں بیٹی (مرکھی اور کونرو) دیبل پہنچ گئیں۔ کوششیں ہوئیں، مگر چنیسر نے لیلاں کی موجودگی میں کسی دوسری عورت سے شادی کا تصور تک مسترد کر دیا۔ تب وہ مفلسی کا لباس پہن کر، خود کو غریب جتلا کر، لیلاں کی ملازمائیں بننے میں کامیاب ہو گئیں۔ اور ایک روز کونرو نے اپنی مامکن لیلاں کو بتایا کہ وہ تو ایک وقت خود شہزادی تھی اور نو لکھے ہار (نو لاکھ روپے والی قیمتی ہار) کی مالکن تھی۔

زیورات کی حریصہ لیلاں نے ہار دیکھنے کے لیے اصرار کیا اور جب نو لکھا ہار اُسے دکھایا گیا تو اس نے اُسے ہر قیمت پر خریدنا چاہا۔ مگر کونرو نے اس کی قیمت پیسوں میں نہ رکھی۔ اس نے تو اس کی قیمت چنیسر کے ساتھ محض ایک شب بسر کرنا رکھی۔ لیلاں راضی ہوئی۔ اس نے بہت کوششیں کیں مگر چنیسر ایسا کرنے پر کبھی تیار نہ ہوا۔ تب ایک رات جب وہ ایک دعوت میں بہت پی کر آیا تو لیلاں نے دھوکے سے کونرو کو اس کے بستر میں سلا دیا۔

صبح جب چنیسر نے لیلاں کے بجائے کونرو کو اپنا ہم بستر پایا تو غصے سے پاگل ہو گیا۔ مگر جب اُسے بتایا گیا کہ لیلاں نے اسے نولکھا ہار کے عوض فروخت کر دیا تو چنیسر کو بہت تذلیل و توہین محسوس ہوئی۔ اس نے لیلاں کو چھوڑ دیا اور کونرو سے شادی کر لی۔ لیلاں کے تاسف اور معافیاں مانگنے کے باوجود اُسے معافی نہ ملی کہ اس نے چنیسر کی محبت کو معمولی ہار کے لیے روند ڈالا تھا۔
(آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ شاہ لطیف نے کہانی کے اس حصے کو کس کس طرح بیان کیا ہوگا!)

خود اپنے حرص کے ہاتھوں دھتکاری ہوئی لیلاں اپنے والدین کے علاقے چلی گئی جہاں کی ایک لڑکی چنیسر کے وزیر کی سنگت تھی۔ مگر لیلاں کا انجام اور اُس کی بدقسمتی دیکھ کر لڑکی والوں نے منگنی توڑ دی۔ لیلاں بیچ میں پڑی اور اور اس شرط پر ان لوگوں کو راضی کر لیا کہ اس شادی کی برات میں چنیسر خود بھی آئے گا۔

جب اپنے وزیر کی برات کے ساتھ چنیسر بھی آیا تو حسین و جمیل لیلاں نقاب پہن کر گانے والیوں کے ساتھ برات کے خیر مقدم میں موجود تھی۔ چنیسر کو وہ رقص بہت پسند آیا بالخصوص نقاب پوش کا۔ اس کی اداؤں، قد کاٹھ اور خوب صورت رقص نے اُسے مکمل طور پر اپنی گرفت میں لے لیا اور جب برداشت سے باہر ہوا تو اس نے اس سے نقاب اٹھانے کی درخواست کی۔ نقاب اٹھا تو وہ حسینہ تو اُس کی اپنی دھتکاری ہوئی محبوبہ بیوی، لیلاں تھی۔ چنیسر فرش پہ گرا اور وہیں جان دیدی۔ لیلاں نے یہ دیکھا تو اس کی روح بھی پرواز کر گئی۔

نوری جام تماچی

کینجھر جھیل کے پاس مہانڑاؤں (محنت کش ملاحوں اور مچھیروں) کی بدبو بھری گندی میلی بستی تھی۔ فیوڈل دور میں دوسرے محنت کشوں کی طرح مچھیرے کمّی کمینے لوگوں میں شمار ہوتے ہیں، دوسرے درجے کے شہری۔ مگر اسی گدڑی میں ایک لعل تھی نوری۔ حسن و جمال میں بے مثال، رکھ رکھاؤ میں شہزادی۔

حکمران جام تماچی کو جب مچھلی کے شکار کی سوجھی تو وہاں اس کی نظر نزاکت و شائستگی کی

مجسم، نوری پر پڑی۔ وہ کام سے گیا کہ حسین و منکسر نوری نے حکمران کو اپنا گرویدہ کر لیا۔ آؤ دیکھا نہ تاؤ اس کے والدین سے اس کا ہاتھ مانگا۔ مچھیروں کی تو گویا قسمت جاگی، انکار کی گنجائش تھی نہ جرأت۔ جام تماچی نے بستی کو انعام و اکرام سے گویا لاد ڈالا۔

بہت سی بیویوں والے جام تماچی نے ایک روز اپنی ساری رانیوں سے بہترین لباس پہننے کو کہا۔ جو سب سے زیادہ پرکشش لباس میں ہوگی وہی اس کے ساتھ تفریحی دورے پر جائے گی۔ سوکنوں والی مسابقت لفظوں کی محتاج تھوڑی ہوتی ہے۔ چنانچہ پوری انسانی قابلیت سے ہر ایک نے خود کو بنایا سنگھارا۔ مگر نوری اپنے ماقبل شادی والے عام لباس میں تھی۔ سوکنوں کے قہقہوں کا مرکز۔

مگر اس انکساری کو جام تماچی نے سب پر ترجیح دی کہ ملکہ بننے کے باوجود وہ اپنی اوقات میں رہی۔ ٹھہراؤ بھری نوری۔ وہی ملکہ عالیہ بنی، وہی جام تماچی کے سفر کی رفیقہ رہی اور اپنی بردباری سے محبت پا گئی۔

شاہ لطیف نے نوری کے حسن سلوک اور حب الوطنی پر اپنی شاعری کے صفحوں کے صفحے وقف کر دیے۔

مومل رانڑو

راجہ نند کی نو بیٹیاں تھیں۔ مومل سب سے خوبصورت تھی۔ مگر فہم و فراست میں سب سے چھوٹی سومل دوسروں سے آگے تھی۔ شکاری بادشاہ نے ایک جنگلی سور کا شکار کر لیا جس کے دانت میں یہ جادوئی قوت تھی کہ اس سے پورے دریا کا پانی خشک ہو جاتا تھا۔ بادشاہ نے اس دانت سے کام لیا۔ دریا سوکھ گیا اور بادشاہ نے خفیہ طور پر اپنا پورا خزانہ اس میں دفن کر دیا۔

ایک جادوگر کو اس راز کا پتہ چلا تو وہ جوگی کا روپ دھارے ایک ایسے دن محل کے پاس جا کر آہ و زاری کرنے لگا جب بادشاہ باہر گیا ہوا تھا۔ گریہ نے رحم دل مومل کو پگھلا دیا، جوگی کو محل میں بلایا اور رونے دھونے کی غرض پوچھی۔ جوگی نے اپنے لاعلاج مرض کا علاج سور کا دانت بتایا۔ سور دانت کی جادوئی طاقت سے بے خبر مومل نے باپ کے پاس رکھا سور کا دانت جوگی کو تھما دیا۔

ایک روز بادشاہ نے دانت تلاش کیا تو نہ ملنے پر مومل نے ساری روداد سنائی۔ غصے سے بپھرا بادشاہ اُسے قتل کرنے ہی والا تھا کہ سومل کی ذہانت نے اسے روک دیا کہ وہ اتنی ہی دولت اُسے پیدا کر کے دے گی۔ وہ ایک ماہر جادوگرنی بھی تھی۔ چنانچہ باقی بہنوں کو ساتھ لے کر دور، دریائے کاک کے کنارے ایک جادوئی محل کھڑا کر دیا۔ جس کی سب چیزیں جادوئی تھیں۔ کاک محل کے دروازے پر خوفناک جادوئی شیر تھے جو مسافر کے داخل ہونے پر دھاڑتے تھے۔ محل کے گرد پانی بھری خندق تھی جو بہت گہری لگتی تھی۔ محل کے اندر بھی حسین مومل کے کمرے کا راستہ انتہائی پر پیچ تھا۔

سومل نے اعلان کیا کہ خوبصورت مومل سے شادی کا خواہش مند کاک محل میں داخل ہو کر اُس کے کمرے تک جائے اور اُسے اپنا جیون ساتھی بنالے۔ سیکڑوں نوجوان قسمت آزمائی میں ناکام و نامراد لوٹے، اس لیے کہ ''ناتر'' نامی چالاک خادمہ پُر پیچ راستے میں اچانک مسافر کو چھوڑ کر غائب ہو جاتی۔ مومل کے ڈاکو مسافر کو لوٹ لیتے اور مسافر اپنی جان بچا کر بھاگ جاتا۔ یوں لڑکیوں نے بے تحاشا دولت جمع کی۔

ایک دن تھرکا راجہ حمیر سومرو اپنے تین وزیروں سمیت سیر و شکار پر تھا کہ ایک درخت کے نیچے ایک جوگی کو بیٹھا پایا۔ جوگی نے انہیں بتایا کہ ایک وقت وہ بھی بادشاہ تھا مگر مومل کے حسن و جمال نے اس کی یہ حالت بنا رکھی ہے۔ چنانچہ راجہ کو بھی مومل کے حصول کا اشتیاق ہوا۔ شاہ حمیر اور اس کے دو ساتھی تو ناکام رہے مگر عقلمند ''رانڑو میندھرو'' اس سارے جادوئی کھیل کو بھانپ گیا۔ وہ مومل کے کمرے میں کامیابی سے داخل ہوا جہاں ایک جیسے سات پلنگ بچھے تھے۔ اسے معلوم ہوا کہ چھ تو ایسے ہیں جن پر بیٹھ جاؤ تو سیدھا نیچے تلواروں بھری خندق میں قتل ہو جانا مقدر ہے۔ وہ ساتویں پر بیٹھ گیا۔ مومل نے اس کی عقل مندی پر اُسے پسند کیا اور شادی پر تیار ہو گئی۔

رانڑو میندھرو کے دوست اور راجہ حمیر سومرو نے اُس سے مومل کا دیدار کروانے کی خواہش کا اظہار کیا تو رانڑو نے راجہ کو گوالا کا روپ دھارنے کا مشورہ دیا تا کہ مومل اُسے پہچان نہ پائے۔

مگر مومل نے گوالے کی اصلیت جان لی اور اس سے کہا کہ اس کے لیے گائے کا دودھ دوہے۔ بادشاہ اپنی اس بے عزتی کا رانڑو سے بدلہ لینے کا عزم لیے اپنے بقیہ وزیروں کے ساتھ

واپس ہوا۔

اس نے اپنے وزیر کے لیے اداس ہونے کا کہلوا کر رانڑو کو بلوالیا اور پھر جیل میں ڈال دیا۔ رہائی اس شرط پر کہ وہ مومل سے نہیں ملے گا۔ مگر وہ راتوں کو اونٹ پر سوار ہو جاتا اور مومل کا وصال پاتا۔ راز معلوم ہوا، پابندی لگ گئی۔ اُدھر رانڑو کی طویل غیر حاضری سے ملول مومل کو خوش رکھنے کا طریقہ سومل نے یہ نکالا کہ خود رانڑو کا بھیس بنا کر اس کے ساتھ سونے لگی۔ ایک رات جب رانڑو آیا، مومل کے ساتھ ایک مرد کو سوتے دیکھا تو دونوں کو قتل کرنے کے بجائے اپنی چھڑی وہاں رکھ کر واپس چلا گیا۔

جب مومل کو اپنی غلطی کا اندازہ ہوا تو اس نے بہت پیغام بھیجے مگر رانڑو مڑ کر نہ آیا۔ مجبور ہو کر مومل نے تاجر کا بھیس بدلا اور رانڑو کے مکان کے مقابل ایک مکان لے کر بالآخر رانڑو سے دوستی بنالی۔

دونوں دوست شطرنج کے دلدادہ کھلاڑی تھے۔ وہ دیر تک شطرنج کھیلتے تھے۔ ایک روز رانڑو نے مومل کے ہاتھ کا تل دیکھ کر اسے پہچان لیا اور اسے دھتکار لیا۔

مومل ہر کوشش میں ناکام بالآخر چتا تیار کروا کر اس میں کود گئی۔ رانڑو نے ماجرا دیکھا تو وہ بھی آگ میں۔ دونوں عشاق دائمی وصال سے ہمکنار۔

شارک کے شکاری (سُر گھاتو)

ابھایو نامی ماہی گیر کے سات بیٹے تھے۔ ساتواں بیٹا مورڑو کمزور و ناتواں تھا۔ اس لیے اُس کے چھ بھائی ماہی گیری کرنے جاتے اور وہ گھر میں رہتا۔

ایک روز جب بھائی گھر نہیں پہنچے تو مورڑو اُن کی تلاش میں چل پڑا۔ اسے معلوم ہوا کہ وہ بھنور میں پھنس کر ڈوب گئے اور انہیں شارک مچھلی نے نگل لیا۔

معذور مگر ذہین مورڑو نے لوہاروں سے اتنا بڑا پنجرہ بنانے کی فرمائش کی جس میں وہ بخوبی سما جاتا۔ اور پنجرے کے بیرونی کناروں پر تلوار کی دھار والے پھل اور تیز کنڈیاں نصب کرنے

کی ہدایت کی۔ وہ اس پنجرے میں بیٹھ گیا اور ملاحوں نے مضبوط رسی کی مدد سے اسے شارک والے علاقے میں پانی میں ڈال دیا۔ شارک نے اسے ہڑپنے کو منہ کھولا اور مورڑو کو نگل لیا۔ مگر اس کے تو جبڑے چھل گئے۔ مورڑو نے ساتھی ملاحوں کو رسی ہلا ہلا کر ڈور کھینچنے کا اشارہ کیا۔ چنانچہ پنجرہ مع شارک ساحل پر..... سب نے ہتھیاروں سے دیوہیکل مچھلی کو مار دیا اور مورڑو کو پنجرے میں سے صحیح سلامت نکال لیا۔

مورڑو نے مچھلی کا پیٹ چیرا۔ چھ بھائیوں کی ہڈیاں برآمد کیں انہیں پہاڑ کے قریب دفن کیا اور وہیں قیام پذیر ہوا۔

سسی پنوں

آپ بس دل میں یہ طے کرلیں کہ سسی پنوں کی داستان شاہ کی اپنی داستانِ عشق ہے۔ وہ بہت پیار، توجہ یکسوئی خلوص اور ساون کی بارشوں کی طرح بسیرا کر کے بڑی تفصیل سے اِس داستان میں سے اپنے کام کی چیزوں کو الگ کر کے برتتا ہے۔ شاہ خود داستان پہ زیادہ بات نہیں کرتا ۔اس نے اس داستان کے کرداروں پہ گزشت کی سرگزشت بیان کی۔

بے اولاد برہمنوں نے اپنی نوزائیدہ بیٹی کو اس خوف سے صندوق میں ڈال کر دریا برد کر دیا کہ نجومیوں نے کہا تھا کہ وہ بڑی ہو کر کسی مسلمان سے شادی کرے گی۔ دریا کے بہاؤ میں بہتی پیٹی دور بھنبھور کے بے اولاد اور امیر مسلمان کے دھوبی گھاٹ پر لنگر انداز ہوئی۔ بھنبھور کا قصبہ کوٹری اور کراچی کے درمیان موجودہ جنکشا ہی سٹیشن کے قریب واقع تھا۔ ماہ رُخ بچی کو سسی یعنی چاند کا نام دیا گیا۔ بے اولاد میاں بیوی نے اس پر ناز و نعم کی بارشیں برسا دیں۔ بچی اُن میں ایسے پلی کہ حسن و جمال کی تمثیل بن کر جوان ہوئی۔ ایسے جیسے تاریک رات میں کہکشاں۔ بدرِ کامل۔ ابرو جیسے مہینے کا نیا نیا نکلا چاند، فسوں ساز حسن، آہو چشم، سرمگیں نگاہ، عارض روشن تر از ماہ، تابانِ سحر گاہ کی طرح پُرنور۔(2)

بھنبھور کا حسن، رابعہ خضداری کی شاعری کی طرح مشہور ہوا۔ اس زمانے کے تجارتی

کاروانوں کے شتر بان ''رودکیوں'' نے سسی کو دیکھا، آنکھیں چندھیا گئیں، اور زبانیں گویا ہوئیں۔ اور خلقِ خدا کی گویائی تو براعظمیں پھلانگتی ہے۔ اُسے دریا کیا روکیں گے اور صحرا کیا تھکائیں گے۔ چنانچہ پہاڑوں کے بیچ بل کھاتی ہوئی یہ آوازیں بلوچستان وارد ہوگئیں۔

کیچ کے حاکم زادے پنہوں کے کانوں کے بھاگ میں عشق کا رسیونگ سٹیشن ہونا لکھا گیا تھا۔ آیئے بلوچوں کو کسی نہ کسی صورت کھینچ تان کے عرب بنانے والے ''عرب سازوں'' کی بات کا حوالہ دیتے ہیں؛ ''پنہوں خلیفہ بغداد، ولید کی طرف سے کیچ میں مقرر کردہ حاکم ہارون کی آل اولاد تھا۔ پنہوں کا والد آری جام تھا جسے اُس کے دادا ہوت کے نام سے بھی جانا جاتا ہے''۔(3)

بہرحال حاکم زادہ نے سوداگر کا روپ دھار لیا، ایک عطر فروش قافلہ تشکیل دیا اور دل کے ریڈ سکوائر بھنبھور کو عشق کا دارالحکومت بنانے چل پڑا۔ (سندھ بلوچستان کے بیچ عطر فروشی، تاریخ دانوں کے لیے دلچسپی سے خالی نہ ہوگی)۔ بہرحال طُور، تجلی کھانے، خود بھنبھور چلا آیا۔ اس جادونگری نے سردار زادہ کو آنکھ کی سرخ ڈوریوں سے باندھ لیا۔ دھوبن نے سردار زادے کے ''پیٹے'' کو ایک دھوبی کے پیٹے میں ڈھال دیا۔ تاریخ میں لکھا ہے کہ انگلینڈ کا ایک بادشاہ اپنی محبوبہ سے شادی کی خاطر تخت کو لات مار کر ایک عام آدمی بن جاتا ہے۔ ہمارا سردار پنہوں تو عام آدمی بھی نہیں رہ جاتا۔ وہ تو دھوبی بن جاتا ہے، مقدس بن جاتا ہے۔

مگر اس کھیل میں صرف طُور بھسم نہیں ہوتا، خود تجلی بھی جل کر خاکستر ہوگئی۔ خاکستر خاکستر سے ملی، سارے تضاد تحلیل ہوگئے۔ سسی پنہوں میں ڈھل جاتی ہے، پنہوں سسی بن جاتا ہے، ہر طرح کی دوئی ختم۔ عشق تو اپنے ساتھ مساوات بھی لاتا ہے۔

پہلے دھوبی دھوبن کا بن چکا تھا اب دھوبن دھوبی کی بن گئی۔ شادی ہوگئی۔ اسباب و علل کو ضدین کا اجتماع جو مقصود تھا۔

مگر، بڑے فن کار کی صناعی دیکھنا تو ابھی باقی ہے کہ اس نے وصل و فصل کے درمیان ایک باریک لکیر تو قائم رکھنی تھی، حصولِ محبت اور تلاشِ محبت کے مکاتیب کو الگ الگ تو رکھنا تھا، منزل اور جدوجہد میں بالشت بھر کا فاصلہ تو رکھنا تھا۔ چنانچہ عطر کا قافلہ پنہوں کی شکل میں مکران کی ساری

خوشبو بھنبھور کے قدموں میں انڈیل کر بن سردار زادے کے کیچ واپس پہنچا۔ سردار زادے کے دھوبی میں ڈھلنے کا معجزہ سنایا تو ردِ انقلاب سردار کو بچانے، اور سرداریت کو بازیاب کرنے غراتی و بڑبڑاتی تیز رفتار مہاریوں پہ بیٹھ کر بھنبھور پہنچا۔ انہوں نے سسی پنہوں کو بظاہر شادی کے جشن میں مشغول رکھا اور رات کے آخری پہر تک ناؤ نوش چلایا۔ اِدھر پنہوں کا انتظار کرتے کرتے سسی کی آنکھ لگ گئی، اُدھر دھوکے بازوں نے نشے میں دُھت پنہوں کو مہاری پہ باندھ لیا اور کیچ کی جانب یہ جا وہ جا روانہ ہوا۔

سسی کی آنکھ کھلی تو پنہوں نا موجود۔ نہ کیچی نہ کارواں۔ اچانک پجاری کا مندر ڈھے جاتا ہے، کمیونسٹ کا سوویت یونین ٹوٹ جاتا ہے، پتھروں کو ناطق بنانے والی سموگنگ ہو جاتی ہے کہ بُرفت اور بروہی اس کے دوپٹے، یعنی پنہوں کو اغواء کر کے اُس کا پاک سر ننگا کر چکے تھے، اُس کی دنیا اندھیر کر چکے تھے۔ بس ایک، خوابِ گراں کی خلش کی حکمرانی رہ جاتی ہے، فراق کی ازلی ابدی سلگ قائم ہو جاتی ہے۔

مگر پنہوں تو سسی کی رگ رگ میں نغمہ زن ہے۔ وہ بھلا ''اور'' کیا دیکھے گی، وہ بھلا ''اور کو'' کیا دیکھے گی۔ دید بیکار کہ اُس میں منظر یعنی پنہوں کے جلوے نہیں ہیں۔ حسن و جمال کی ملکہ کو چاہنے والے تو بے شمار مگر اُسے پنہوں سا کوئی کہاں ملے گا۔ پنہوں تو اُس کے لیے چراغِ زیرِ داماں ہے۔ سسی کی افسردہ حال تنہائی پیڑ اور پال قلعے کی قید با مشقت سے زیادہ اذیت ناک بن جاتی ہے۔ البیلا پنہوں، سسی کی سعیِ پیہم کی منتہا ہے۔ وہ اس کے سوگ اور روگ میں دن رین روتی ہے۔ بھنبھور کی رنگینی تو بلوچ کے دم سے تھی، بے رنگ دنیا شاہ لطیف کی سسی کو ہرگز قبول نہ تھی۔ بھنبھور کی صبا میں جب بوئے پنہوں نہ ہو تو پھر اُس کی شام کیا صبح کیا۔ آدیسی تو اٹھ گیا تھا بھنبھور کا خالی پن تو موت بن چکا تھا۔ بھنبھور اندھیر ہے، جہنم کی آگ ہے۔ پنہوں نہیں تو گھر گھر نہیں میت گاہ ہے، بھنبھور بھنبھور نہیں، ماتمستان ہے۔۔۔۔ اور شاہ کی سسی ماتمستان کی شہری ہرگز نہ تھی۔

اُس کا بنیادی انسانی حق چھن گیا تھا، اُس کے جذبے کو بے وقار کر دیا گیا تھا، اُس کے عشق کی توہین ہو چکی تھی۔ چنانچہ کیچ اور بھنبھور مقناطیس کے قطبین بن جاتے ہیں۔ وہ اپنے چشمِ تر کی

قسم کھاتی ہے کہ پنہوں کو نہیں بھولے گی۔ آئینِ مہر و وفا یہ ہے کہ ترکِ محبت نہیں کیا کرتے (شاہ)۔

اور پھر یہی کمٹ منٹ کیچ کی آشا سے معمور، سسی کو سراسر باغی بناتی ہے۔ اب طالب اوطاق میں بیٹھ کر کیوں روئے۔ وہ گھر بیٹھ کر مقدر کی کٹھ پتلی نہیں بنتی بلکہ جذبہِ الفت کا نام لے کر محبوب کی تلاش میں نکل پڑتی ہے۔ اُسی کی تلاش میں ہر افتادِ سہنی ہے۔ پنہوں کی خاطر اسے ساری عمر بیاباں در بیاباں سر کرنا ہے۔ وہ پنہوں آشنا سے خود آشنا بن جاتی ہے اور تب یہ پنہوں آشنا، یہ خود آشنا منزل آشنا بن جاتی ہے، وندر آشنا بن جاتی ہے۔ فریدالدین عطار کی ''منطق الطیور'' کے انعقاد کا سفر شروع ہو جاتا ہے۔

محبت اور وارفتگی میدان زادی کو کوہ پیمائی کے انجانے فریضے پر لا پٹختی ہے۔ اور پھر، بلوچوں کی یہ داسی، ان کے چرنوں کی دھول، دکھی، بے ہمدرد، بے کس، بے سہارا انقلابن، بھنبھور سے کیچ چل پڑتی ہے۔ محبت، سسی سے بھنبھور کا دودھ چھڑوا لیتی ہے اور یہ جوگن عزمِ بے کراں بن کر جوشِ جنون سے مسلح ہو کر، پس کوہِ گراں کی جانب رواں ہو جاتی ہے۔

ساری دنیا چھوڑ کر، جسم و جاں کی پابندی کو جھٹک کر، سسی اونٹوں کے قدموں کے نشان ٹٹولتی چلی گئی۔ کیا صحرا کیا کوہ، شاہد و مشہود کے وصل کی تانگ ہر انسانی جذبے سے قوی تر ہے۔ جان چلی جائے بس خوں بہا میں نگاہِ دوست میسر ہو۔

ذرا سا کہانی کے بہاؤ سے باہر نکلتے ہیں تو معلوم ہوگا کہ داستانِ سسی پنہوں ایک اور لحاظ سے بھی مختلف داستان ہے۔ ہم صدیوں سے سنتے چلے آ رہے ہیں کہ حسن کا دیس تو کوہستان ہے، کوہِ قاف ہے۔ مگر یہاں حسن کی رانی میدان زادی ہے، قاف کی باسی نہیں۔ دوسری بات بھی نوٹ کر لیجیے، پراسیس کی بات؛ کہ یہاں پنہوں کی صورت میں عشق پری کی تلاش میں کوہِ قاف نہیں بلکہ اس کے برعکس اس کی تلاش میں پہاڑ سے میدان اترتا ہے۔ کچھ ہی عرصہ بعد کیچ سے آیا ہوا rescue فوجی دستہ اِس عشق یعنی پنہوں کو حسن میں بدل دیتا ہے۔ اور اب سابقہ حسن یعنی سسی عشق بن جاتی ہے۔ اور یہ عشق بنا ہوا حسن، حسن بنے عشق سے وصال کی تڑپ میں پہاڑ پہ چڑھتی ہے۔ بلوچستان تُو کیا چیز ہے یار!!۔

سسی پنہوں کی داستان ایک اور طرح سے بھی اب تک کی ساری روایات کی نفی کرتی ہے۔ یہاں ایک مرد عورت کے پیچھے نہیں جا رہا بلکہ ایک عورت مرد کے پیچھے جاتی ہے۔ بلاشبہ سسی پنہوں کی داستان فلسفہ سے بھری داستان ہے۔

مگر کمٹ منٹ کی معراج تو genderless ہوتی ہے۔ پھر ہم سسی پنہوں کے مقدس ومعتبر میدان کے اندر مذکر مونث کی لکیر کیوں پیٹ رہے ہیں؟ دل کرتا ہے اگلے سارے صفحے مذکر مونث کے پنجے سے پاک بلوچی زبان میں لکھوں!۔

سسی بھنبھور چھوڑ جاتی ہے۔ کیچ کی جانب خون آشام سفر جاری ہے۔ سفر بھی جہاز وموٹر گھوڑے پہ نہیں سسی نے یہ سفر اپنے پیروں کے چھالوں پر کیا، اپنے زخموں پر، بہتے خون پہ۔

وہ مکمل طور پر اسباب وعلل کے حوالے۔ اور اسباب وعلل تو اکلوتے بیٹوں جیسے نخرے کرتے ہیں۔ اور انتہائی ناترسی کے ساتھ سسی کے سامنے راستے میں (لسبیلہ کے علاقے منہیار پہاڑ کے چار میل مشرق میں) ایک خیمہ، کھڑا کرتے ہیں۔ سسی خیمہ والے سے کیچی قافلے کا پوچھتی ہے۔ خیمہ والے نے اس کے حسن و جمال کو دیکھا، تو اُس کا شیطان جاگ گیا۔ اس کی ہوس دہک اٹھی۔ اس نے پاکیزگی پہ دست درازی کی کوشش کی۔ عشق پجارن شدتِ آلام والے سلسلے کے اِس بڑے وار کو اکیلی سہہ نہ سکتی تھی۔ اب کے اُس نے عشق دیوتا سے مدد مانگی۔ بلوچستان شق ہوگیا اور پورا ملک اِس مقدسہ کے پاک سر کا دوپٹہ بنا۔ سرخ دوپٹے کا پلو البتہ سرخ پرچم بننے باہر رہا۔ ہم نے عظمت دیکھی کہ شاہ نے سسی کے اس انجام کو قابلِ رشک قرار دیا۔

اس داستان کا ایک اور خوبصورت موڑ دیکھیے: اسی لمحے سے، بلوچستان سسی کی قبر نہ رہا، محبت کا ویٹیکن بن گیا۔

پوری دھرتی تھرا گئی تو خیمے والے شیطان کی کیا حیثیت؟۔ وہ عشق کے اِس معجزے سے کانپ اٹھا۔ وہ اس ناقابلِ بیاں جرم کا کفارہ ہی ادا کرسکتا تھا۔ چنانچہ وہ اس قبر کے خدام کا سربراہ بنا۔ ولّن عشق کے خزانے کے اولین مجاور میں ڈھل گیا۔

اُدھر مغوی پرومی تھیس نے جب ہوش وحواس پائے تو خود کو اونٹ کے کوہان چٹان پہ

بندھا پایا۔ بے بسی کی کرگس اس کی عاشق روح کا گوشت نوچتی تھی۔ دُہائیاں چیخیں صدا بہ صحرا ہوئیں۔ ہرکارے اُسے کیچ پہنچا گئے۔

مگر وہ تو کام سے جا چکا تھا۔ روح تو بھنبھور کی باندی تھی اُسے کیچ میں کون بند کرسکتا تھا۔ بلوچستان کی جان تو سندھ میں تھی۔ بالآخر جبر کو جذبے کے آگے جھکنا پڑا۔ کوہِ شاشان کو شاہی زنجیریں کیا جکڑ سکتی ہیں۔ رسے رسیاں توڑ ''جبل''، ''پٹ'' کی طرف سرپٹ بھاگا۔ آواز سے تیز، بس بلوچی لفظ ''شیموش'' کی تجسیم۔ راستے میں کیچ سے بہت دور لسبیلہ میں بیت اللحم بنا ایک مقبرہ اس کی توجہ کا طالب ہوا۔ معلوم ہوا انقلاب اپنی جون بدل کر زیرِ زمین چلا گیا تھا۔ اُس نے زمین کو شگاف پڑنے کا کہا۔ اور بلوچستان کو تو عشق کا ملتجی حکم ہی شق کرسکتا ہے۔ دھرتی دوسری بار کریک ہوگئی۔ پنہوں بغیر کسی پس وپیش کے وہیں انڈر گراؤنڈ ہوگیا۔

عمر ماروی

حسین وجمیل ماروی بھیڑ پال معیشت سے متعلق ہے۔ عمر بادشاہ اُس کا حسن دیکھ کر اسے زبردستی اٹھوا کر اپنے محل میں لاتا ہے۔ مگر ماروی تو نہ اس سے محبت کرتی ہے۔ نہ شادی پر تیار ہوتی ہے۔ سونا، چاندی، جواہرات، نوکر، چاکر اور قیمتی ملبوسات سب قابلِ نفرت کہ دل تو اپنے وطن، اپنے لوگوں میں ہوتا ہے۔ وہ گریہ بن جاتی ہے۔ بادشاہ کا خواہشوں کا سارا محل دھڑام کہ وہ نہ نہاتی دھوتی ہے، نہ بناؤ سنگھار کرتی ہے، نہ ہنستی بولتی ہے۔ مجبوراً بادشاہ اُسے واپس اپنے وطن ملیر بھجوا دیتا ہے۔

مگر یہاں ملیر میں تو ماروی کے اغوا سے پیدا شدہ شکوک کا پودا تمبیل پہاڑ جتنا بلند ومہیب ہو چکا ہوتا ہے۔ رام کو سیتا تک پہ شک ہوا تھا یہ تو عام ماروی تھی۔ سب مشکوک کہ بھلا یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ ماروی باعصمت واپس آئی ہوگی؟۔ باغیرت ماروی کو سیتا ہی کی طرح فیوڈل معیار پر پورا اترنے کے لیے مروج بھیانک ترین قسم اٹھانی پڑی۔ وہ سلامت سلامت آگ میں سے چل کر نکلی۔ چیف جسٹس اگنی دیوی خود کو جلنے سے نہ بچا سکی مگر اگلی کو بے گناہ ثابت کردیا۔

یوں ماروی اپنی کمیونٹی میں قبول کی گئی، اور ایک نارمل ازدواجی زندگی گزارنے کی شرائط پوری کر گئی۔

آیئے شاہ کی شاعری کے اس باب سے ایک ٹکڑا دیکھتے ہیں جس کا خوب صورت ترجمہ ابن اِنشا نے کیا تھا۔

نے پیامی ہے نہ پیغامِ عزیزاں کوئی
گردِ صحرا سے نہ اُبھرے گا شُتر باں کوئی
میرے اللہ! مری حسرتِ دیدار کو دیکھ
بھیج اس دیس میں اُس دیس کا مہماں کوئی
خوش ہوں مسرور ہوں یہ راہیں یہ قلعے یہ حصار
آئے پھر قطع مسافت کئے جولاں کوئی
دھوؤں اِن آنکھوں سے اُس کے قدمِ گرد آلود
جان سکتا ہے مرے شوق کا پایاں کوئی
دُور افتادہوں محبوس ہوں غم دیدہ ہوں
لوگ اس درد کی تسکین کا ساماں کوئی

(4)

حوالہ جات

1۔ مری، محمد خان ہفت روزہ نوکیں دور، کوئٹہ۔ 13 مئی 1968 صفحہ 8۔
2۔ مثنوی نامہ عشق۔ 1959۔ مرتب ڈاکٹر وحید قریشی، پنجابی ادبی اکیڈمی لاہور
3۔ فہمیدہ حسین شاہ لطیف کی شاعری میں۔۔۔۔۔ صفحہ 485
4- نوکیں دور، کوئٹہ۔ 13 مئی 1968۔ صفحہ 12

میوز، میوزک

شاہ لطیف کو موسیقی سے عشق تھا۔ اب وہ مشہور فقرہ تو مجھے ہلکا لگتا ہے کہ ''وہ موسیقی کو عبادت سمجھتا تھا'' مگر یہ بات ہے کہ اُس نے موسیقی کو اپنے روزمرہ کے معمولات میں شامل کر رکھا تھا۔ وہ خود بہت بڑا موسیقی دان تھا۔ اسی نسبت سے اس کی پوری شاعری موسیقی ہے۔ کہتے ہیں کہ سندھی موسیقی اور موسیقیت کے اس موجد کا انتقال بھی موسیقی کی ایک محفل میں ہوا۔

بہر حال اب تو موسیقی اس کی تعلیمات کا ایک حصہ بن چکی ہے۔ شاہ لطیف اور شہباز قلندر کے پیروکاروں میں ایک دلچسپ فرق ہے۔ شاہ کے لوگ موسیقی پہ زور دیتے ہیں جب کہ بقیہ درگاہوں کے لوگ رقص یعنی دھمال پر۔

اور یہ موسیقی کبھی بھی آہنگ میں درشت نہیں ہوتی۔ وہ مولانا روم کی طرح گرج کی گھن گرج کو نہیں بلکہ بارش کی نرم آواز کو پھولوں کی پیدائش و افزائش کا باعث سمجھتی ہے۔

اس نے اپنے مجموعہ کلام کو مختلف راگوں اور لوک دھنوں میں ترتیب دیا۔ یہ کُل تیس راگوں اور دھنوں پر مشتمل ادبی آرٹ کا بے مثال شاہکار ہے۔

شاہ عبداللطیف بھٹائی نے اپنی حیاتی میں ہی بھٹ شاہ پر سماع اور راگ کی جو روایت کی ابتدا کی تھی، وہ آج تک اسی طرح قائم ہے۔ ہر رات عشا کی نماز کے بعد شاہ صاحب کے مزار پر موسیقار اُس کا ایک راگ شروع کرتے ہیں اور فجر کی نماز سے پہلے تک گاتے رہتے ہیں۔ شاہ کے زمانے میں سماع کی جگہ پر آگ جلائی جاتی تھی اور ذاکر آگ کے گرد بیٹھ کر ذکر

کرتے تھے۔ یہ آگ سردی اور گرمی دونوں موسموں میں جلائی جاتی تھی۔ سب سے پہلے ''ہواَلو'' کی تین تسبیح پڑھی جاتیں اور پھر درویشوں کے گروہ کا لیڈر راگ بلاول یا راگ دھنا سری میں بیت کا ایک مصرع گاتا، مصرع کے بعد ''القارعہ ما القارعہ'' آیت کو آواز کے زیر و بم سے ادا کرتا اور زبان سے ضربیں لگاتا۔ سب درویش ضربوں کی تال پر آہستہ خرام رقص کرتے ہوئے ایک پورے دائرے اور دوسرے دائرے کی چوتھائی میں سماع کو ختم کرتے۔ آخر میں سب درویش آگ کے مغرب میں بیٹھ کر کسی راگ میں ابیات گاتے۔(1)

یہ سلسلہ ایک رات بھی قضا ہوئے بغیر گذشتہ چار سو سالوں سے جاری وساری ہے۔

شاہ کے راگ اور اُن کے گانے کی ترتیب کچھ یوں ہے:

کلیان: عشا کی نماز کے بعد گایا جاتا ہے۔ چونکہ یہ شام راگ ہے، اس لیے سب سے پہلے یہ گایا جاتا ہے۔

ایمن: یہ کلیان کے بعد گایا جاتا ہے۔

کھنبھات: اس راگ میں چاند اور چاندنی راتوں کے مضامین ہیں، اس لیے یہ راگ، ایمن کے بعد چاندنی راتوں میں گایا جاتا ہے۔

سری راگ: کھنبھات کے بعد۔

ساموںڈی: آدھی رات سے پہلے۔

سونہڑیں: چوں کہ سونہڑیں آدھی رات کو دریا پار کر کے میہار سے ملنے جاتی تھی، اس لیے یہ راگ آدھی رات کو گایا جاتا ہے۔

کیڈارو: سونہڑیں کے بعد گایا جاتا ہے۔ مگر اس میں چوں کہ امام حسین کی شہادت کے مضامین ہیں، اس لیے اسے صرف محرم میں گاتے ہیں۔

آبری، معذوری، دیسی، حسینی، کوہیاری: یہ سب سونہڑیں کے بعد گائے جاتے ہیں۔ یہ پانچوں راگ سسی پنوں کے داستاں کے بارے میں ہیں۔ شاہ کے بارے میں موجود کتابوں میں لکھا ہے کہ معذوری لسبیلہ اور خضدار کے علاقوں کی ایک دُھن کا نام ہے۔ ان

علاقوں میں جب کسی عورت پر بھوت پریت کا سایہ ہو جاتا ہے تو اس کے علاج کے لیے کسی سرندہ بجانے والے کو بلایا جاتا ہے۔ وہ سرندہ پر ایسے لہرے بچاتا ہے کہ مریضہ جھومنے لگتی ہے اور جھومتے جھومتے تھک کر لیٹ جاتی ہے اور جب اُٹھتی ہے تو سایہ ختم ہو چکا ہوتا ہے۔ ایسی سایہ زدہ عورت کو معذور سمجھا جاتا ہے اور اسی نسبت سے اس دُھن کو معذوری کہا گیا ہے۔ سسی نے چوں کہ بلوچستان کے پہاڑی علاقوں کا سفر کیا تھا، اسی لیے شاہ نے سسی کے ایک سر کا نام معذوری رکھا۔ اس سُر کا مرکزی خیال بھی جستجو اور تلاش، راہ کی مشکلیں اور مقصد کے حصول کا عزم ہے۔ کوہیاری' کبھی گایا جاتا ہے کبھی نہیں۔ خضدار کے علاقے کو ''کوہیار'' کہا جاتا ہے یعنی پہاڑی دوست۔ سندھ میں یہ ایک دھن کا نام ہے۔ اس میں زیادہ تر سسی سے متعلق کلام گایا جاتا ہے۔(2)

سورٹھ، بردوسندھی، رانو: یہ تینوں راگ آدھی رات کو گائے جاتے ہیں۔

کاپائتی اور کھاہوڑی: ناموں کی نسبت سے کاتنے والیوں اور محنت کشوں کے پیشوں سے ہے۔ اس راگ میں ایسے محنت کشوں کا ذکر ہے جو رات کے پچھلے پہر اٹھ کر محنت مزدوری کرتے ہیں، اس لیے یہ راگ رات کے پچھلے پہر گایا جاتا ہے۔

رامکلی: اس میں جوگیوں اور بیراگیوں کا ذکر ہے جو رات کے پچھلے پہر اٹھ کر عبادت کرتے ہیں، اس لیے یہ راگ رات کے پچھلے پہر میں گایا جاتا ہے۔

ڈھر، بلاول، رپ، آسا، لیلاں: سردیوں کی راتوں میں۔

مارئی: اس راگ میں عصمت پروری اور حب الوطنی کے مضامین ہیں، اس لیے یہ راگ فجر کی نماز سے پہلے گایا جاتا ہے۔

دھنا سری: یہ حمدیہ راگ ہے، اس لیے صبح سویرے محفل برخواست ہونے والی دعا سے پہلے گایا جاتا ہے۔(3)

حوالہ جات

1- تناصرو، منظور احمد۔ شاہ عبدالطیف بھٹائی، حیات وافکار۔ 2009۔ سندھیکا۔ صفحہ 75

2- تناصرو، منظور احمد۔ شاہ عبدالطیف بھٹائی، حیات وافکار۔ 2009۔ سندھیکا۔ صفحہ 218

3- تناصرو، منظور احمد۔ شاہ عبدالطیف بھٹائی، حیات وافکار۔ 2009۔ سندھیکا۔ صفحہ 80

شاہ لطیف، فطرت کا دوست

کسی طرح کے تقابل سے دامن بچا کر اُسی ذات کی بات کرتا ہوں جو میرے مطالعے میں فطرت کا سب سے بڑا طرف دار اور بیان کنندہ ہے۔ ہاں توکلی مست البتہ اُسی پائے میں آ جاتا ہے۔ مگر مست ولطیف مقابل تھوڑے ہیں، وہ تو ایک دوسرے کا تکملہ ہیں۔

شاہ لطیف اور توکلی مست فطرت کو کبھی بھی بے جان نہیں سمجھتے۔ وہ باقاعدہ اُس سے بات کرتے ہیں، اس سے بات کرواتے ہیں۔ یوں گفتگو ہوتی ہے۔ وہ نہ صرف اُس سے گفتگو کرتے ہیں، بلکہ وہ تو اس سے حجت کرتے ہیں، بحث کرتے ہیں، پچکارتے ہیں، دھمکاتے ہیں، پیر پکڑتے ہیں، اسے برا بھلا کہتے ہیں، اس کی توصیف وتعریف کرتے ہیں۔ بالکل برابر کے ہم پلہ انسان کی طرح۔

مست ولطیف کوہ وکوہسار، ندی وآبشار، جنگل وبیابان، خانہ بدوش وآبادکار، دیہات و شہر سب کچھ دیکھ چکے تھے۔ وہ بھیڑ پال معیشت سے لے کر فیوڈل معاشرے تک کا ذاتی مشاہدہ رکھتے تھے۔ انہوں نے صنعتی دور کے آلات ومظاہر سے استفادہ کیا تھا۔ اس لیے مظاہرِ فطرت اُن کے ہاں قطعاً محدود نہ رہے۔ تقریباً تقریباً ہر وہ چیز جو انسانی آنکھ کی زد میں آ سکتی تھی، سماعت کے میدان میں سما سکتی تھی، آواز وانسانی حیات کی پکڑ میں آ سکتی تھی وہ مست ولطیف نے دیکھا محسوس کیا۔ ''جہیز میں ملی ہوئی'' فطرت میں کوئی منظر کریہہ نہیں ہوتا۔ سب ایک دوسرے کے اعضا ہوتے ہیں۔ مست وشاہ فطرت کے کام آتے ہیں، اُس سے کام لیتے ہیں۔

شاہ لطیف، اپنے سماج کا تجزیہ نگار

شاہ لطیف ایک بھرپور، اور ہمہ جہت شخص تھا۔ بے شمار اوصاف اور اہلیتوں کا مالک۔ اور خلقِ خدا اُس کی انہی صلاحیتوں اور ہنرکاریوں کی بدولت پوجنے کی حد تک اُس سے محبت کرتی چلی آ رہی ہے۔

مگر اس کی سب سے بڑی پہچان ایک دانش ور، فلاسفر اور شاعر کی ہے۔

کسی بھی دانش ور کو اُس کے زمانے، اور اُس کے سماج سے الگ کر کے جانچنا بہت گم راہ کن نتائج دیتا ہے۔ سندھی زبان کے اِس معروف شاعر و دانش ور کو بھی اُس کے ''اُس وقت کے'' سندھ سے جدا کر کے نہیں سمجھا جا سکتا۔ ''اُس وقت کا سندھ'' میں اس لیے کہہ رہا ہوں تا کہ نوجوان نسل شاہ کو آج کے اکیسویں صدی والے گلوبل گاؤں کے ''محلے'' سندھ کے گز سے نہ ناپیں۔

شاہ کے زمانے کا سندھ مشینی زراعت، جدید صنعت اور سائنس و ٹکنالوجی کے ناقابلِ یقیں مقام و رفتار سے ناآشنا تھا۔ شاہ کے زمانے کے سندھ میں سڑک، بجلی، ریلوے، فوج، یونیورسٹی، جینٹکس، خلائی ٹکنالوجی اور آئی ٹی ناقابلِ تصور مظاہر تھے۔ حتیٰ کہ سندھ کا جغرافیہ بھی اور تھا، اور آبادی کی کمپوزیشن یہ نہ تھی جو آج ہے۔

شاہ لطیف کا زمانہ وہ تھا جب کلہوڑوں کی فیوڈل حکمرانی تھی اور اُس حکمرانی پہ مغلوں کی بالادستی تھی۔ وار لارڈز کے داخلی مناقشوں اور پیروں سرداروں کے باہمی مفاد پرستانہ دست و گریبانیوں نے سندھ کو بہت بری طرح جھنجھوڑ رکھا تھا۔ سماج مکمل طور پر اتھل پتھل ہو چکا تھا۔

شاہ لطیف نے اپنے سماج کو غلامی کی حد تک بدترین طبقاتی نظام میں جکڑے دیکھا۔ مغل امپیریلزم کی تباہکاریوں کے آثار گاؤں کی سطح تک غلامی کی حد تک موجود تھے۔ انارکی ایسی کہ سماجی فیبرک اکھڑ چکا تھا۔ جہالت و توہم پرستی بہت گہری جڑیں پکڑ چکی تھیں۔ تماشا یہ کہ مغل کا ساتھ دینے والے جاگیردار، پیر اور سردار نے تو مضبوط ہونا ہی تھا وہ مضبوط ہو چکا۔ مگر مغل کا مخالف فیوڈل بھی بہت مضبوط ہو چکا تھا۔ مغل مخالف فیوڈل اس لیے مضبوط ہو چکا تھا کہ عوام نے اپنی آزادی کی امیدیں اُسی ڈائین سے وابستہ کر رکھی تھیں۔ یہ سیاست میں ایک دلچسپ صورت ہے۔ آج بھی ایسا ہی ہے، صرف سندھ میں نہیں ہر جگہ۔ اقتدار میں بھی فیوڈل اور حزبِ مخالف کے سربراہ بھی فیوڈل۔

ظاہر ہے کہ شاہ لطیف نے اس سارے منظرنامے کو مسترد کرنا تھا مگر وہ تو ایک دانش ور تھا۔ اُس کی کوئی منظّم سیاسی پارٹی نہ تھی، نہ ہی وہ کسی بڑے اور منظّم قبیلے کا سربراہ تھا۔ ایک ایسے ہڑادھڑی والے عرصے میں ایک طرف ذرا سے سماجی سکون کی ضرورت تھی اور دوسری طرف بہت ہی دور سے موڑ کاٹتے ہوئے ایک متبادل سماج کی آبیاری کرنی تھی۔ اُس متبادل سماج کے بنیادی نقش و نگار تو ربع صدی قبل شاہ عنایت شہید رکھ چکا تھا۔ چنانچہ شاہ لطیف اپنے دھیمے اور (معروضی طور پر جائز) دھندلے، اور بالواسطہ انداز میں فیوڈل ازم کی مخالفت کرنے والے دانش وروں کا سربراہ بنا۔ بھنبھور ہو یا چنیسر اور تماچی کا دربار، وہ اسے طبقاتی معاشرے ہی کے بطور بیان کرتا ہے۔ شاہ نے اپنے سماج کو ایک طبقاتی سماج کے بطور دیکھا۔ البتہ اس نے اُسے معاشی معاشرتی اور سیاسی حوالے سے کم، اور اخلاقی حوالے سے زیادہ بیان کیا۔ (typical یوٹوپیائی انداز!)۔

سیاست و معیشت میں ہم تو سیدھے نعرے بازی کے عادی بنا دیے گئے ہیں۔ مگر شاہ عنایت کی تحریک کے کچلے جانے کے فوراً بعد کے ماحول میں یہ نعرے بازی ممکن نہ تھی۔ نہ ہی بڑی شاعری میں ننگی نعرے بازی زیادہ حجم گھیر سکتی ہے۔ اس لیے اگر آپ شاہ کی حسین شاعری کا برقع ذرا سے تفکر سے اٹھا پائیں تو آپ کو صاف نظر آئے گا کہ شاہ کو شخصی آمریت سے گھن آتی ہے۔ وہ دولت اور اقتدار کے چند ہاتھوں میں ارتکاز کو گناہِ کبیرہ گردانتا ہے۔ شاہ ہر طرح کے استبداد اور ظلم

کے خلاف تھا وہ خواہ جس نام سے بھی ہوتا۔

شاہ لطیف کے بارے میں اولین باتیں جو پڑھنے، سمجھنے اور ذہن نشین کرنے کی ہیں، وہ یہ ہیں:

1- اس نے پوری زندگی مال وزر کو حقارت کی نظر سے دیکھا۔

2- اس نے شان وشوکت اور کروفر سے نفرت کی۔

3- اس نے گلیمر اور رومانٹسزم سے ہمیشہ پرہیز کیا۔

4- شاہ نے اپنی زندگی اور شاعری کا رشتہ اپنی سرزمین، اُس سرزمین پر بولی جانے والی زبان اور اُس زبان کو بولنے والے عام لوگوں سے ہمیشہ جوڑے رکھا۔(1)

5- وہ شخصی آزادیوں کے حق میں تھا (محبت کی آزادی فیوڈل معاشرے میں سب سے بڑی آزادی ہوتی ہے۔نہیں؟)۔

6- شاہ لطیف ایسے کسی بھی نظامِ حکومت کے خلاف تھا جو غربت کو جنم دیتا ہو، جہاں مایوسی اور نا امیدی کی پیدائش والا زچہ بچہ وارڈ ہوتا ہو، جہاں بھوک کی بادشاہی ہو، جہاں تن ڈھانپنا دشوار ہو جائے، اور جہاں عوام الناس خانہ بدوشی کی زندگی میں رہن ہوں۔ ماروی کی زبانی وہ کسی طرح کی رعایت، لالچ یا خوف سے حاصل کردہ کسی طرح کے شخصی انعام وآرائش کو حقارت سے دیکھتا ہے۔

شاہ لطیف نفرت، ظلم، تشدد، منافقت اور استحصال سے سخت نفرت کرتا تھا۔ وہ حُسن، سچ اور محبت کا دلدادہ تھا۔ وہ غیر یقینی اور نا امیدی کی فضا میں بھی ''عشق'' کی شوریدہ سری کا مطالبہ کرتا ہے، عشق جو انقلابیوں کا راشن ہوتا ہے۔(2)

شاہ لطیف سارے عوام کو ایک پرمسرت زندگی گزارنے کے مواقع میسر کرنے کی آرزو کرتا ہے۔

ذات پات کا امتیاز تو طبقاتی نظام کی ایک سیاہ خصوصیت ہوتی ہے۔ نچلے محنت کش لوگوں کو نیچ ذات قرر دیا جاتا ہے اور ایک بدترین اپارتھائیڈ نظام وجود میں آجاتا ہے۔ شاہ کا وہ زمانہ

بالخصوص ذات پات کے عروج کا زمانہ تھا۔ ایک انسان دوست دانش ور کسی طرح بھی چمڑے کی رنگت، پیشے کی نوعیت، اور رواجوں رسموں کے فرق کی وجہ سے انسان کو فضلیت یا حقارت کے خانوں میں تقسیم کرنے کو قبول نہیں کرسکتا۔ چنانچہ شاہ لطیف ذات پات اور اونچ نیچ کا بدترین مخالف تھا۔ وہ بتاتا ہے کہ انسان کی قابلیت اور صلاحیت کا ذات برادری سے کوئی واسطہ نہیں ہوتا۔ جو محنت کرتا ہے وہی پاتا ہے (جو وہے سو لھے).....اس نے یہ پیغام دیا کہ اصل عزت واحترام لیاقت وصلاحیت ومحنت سے ہی ملتا ہے۔ اس نے یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ انسانی صورت اور سیرت کا دولت اور شاہی جاہ وجلال سے کوئی واسطہ نہیں ہوتا۔ اور انسانی کردار کی خوبیاں کسی مصنوعیت کی محتاج نہیں ہوتیں۔

چنانچہ وہ محنت کشوں کے بہت سے کرداروں کا نام لے کر ان سے متعلق بات کرتا ہے۔ وہ کسانوں سے، کاتنے والوں سے، جولاہوں سے، لوہاروں سے، ترکھانوں سے، برتن سازوں سے، ماہی گیروں سے، کشتی بانوں سے، کوزہ گروں سے، شتر بانوں سے، اور چرواہوں سے مخاطب ہوتا ہے۔ یہی لوگ اس کا موضوع ہیں۔ وہ انہی کے مسائل، اُن کے حل اور راستے کی مشکلات کے بارے میں جانکاری دیتا ہے۔ شاہ لطیف نے ہاتھ سے محنت کرنے والے مزدوروں کو اور اُن کے کام کو سراہا ہے اور اُن کے اعلیٰ کردار کی گواہی اپنی شاعری میں دی ہے۔ (محنت سے بڑھ کر اعلیٰ کردار بھلا اور کیا ہوسکتا ہے!!)۔ چنانچہ شاہ نے سماج کے سب سے زیادہ کمزور، سب سے زیادہ پس ماندہ اور مظلوم طبقوں کا انتخاب کیا اور انہیں مثالی کرداروں کی صورت عطا کر دی۔ اس کی پوری شاعری میں اور بالخصوص سُر مارئی، کھاہوڑی اور سارنگ میں تو بہت ہی حسین انداز میں غریب لوگوں کی زندگی کی عکاسی کی گئی ہے۔ اس نے کمہار، جولاہے، لوہار، مچھیرے، ملاح، ہاری، کسان، اور دھوبی کی بہت تعریف کی۔ یہ سب کے سب حق حلال (محنت) کی روزی کمانے والے، محبت سے محنت کرنے والے اعلیٰ انسان ہیں۔

مثلاً اس نے لوہار کو یوں عظیم کہا:

.....ایک لوہار زنجیر کی کڑیوں کو ایک دوسرے سے جوڑتا ہے

پھر جولاہے کی پاکی اور عظمت کو اس طرح بیان کیا:

چلو جولاہوں کے پاس چلتے ہیں،
جن کی محبت میں نفاست ہے،
کیوں کہ وہ سارا دن دھاگوں کو جوڑتے ہیں،
توڑنا تو انہوں نے سیکھا ہی نہیں!

(میں آپ کو موضوع سے نہیں بھٹکاتا، مگر میں آپ کے مطالعہ کو چیلنج کرتا ہوں کہ یہ مصرع آپ عالمی ادب میں اور کہیں تلاش نہ کر پائیں گے)۔

پھر اس نے مٹی کے برتن بنا کر انہیں آوی میں پکانے والے کمہار کو یوں بیان کیا:

اے میرے محبوب تم (کمہار کی) آوی سے محبت کرنا سیکھو
جو پورا دن جلتی رہتی ہے مگر دھواں باہر نکلنے نہیں دیتی
(یعنی کہ اف بھی نہیں کرتی)

سسی کو پالنے والی دھوبن کی توصیف اِن الفاظ میں ہوتا ہے:

اے پنہوں مجھ محنت کش دھوبن کو اپنے ساتھ لے چلو
میں سب کام بھی کروں گی اور پانی بھی بھروں گی

پھر آیئے ذرا دیکھیں کہ اس نے روزی رساں، اور نائب اللہ فی الارض دہقان اور کسان کو کس عظمت اور شان سے بیان کیا ہے:

اپنے بیج لے کر کسان کھیتوں میں جب محبت کے ساتھ بوتے ہیں
تو ان کی محنت کو دیکھتے ہوئے قدرت بھی راضی ہو کر پانی برساتی ہے
اور یوں تمام عالم آباد ہوتا ہے

کسان، محنت، کاشت، فصل۔۔۔۔۔کبھی کبھی لگتا ہے شاہ لطیف بہت قدیم زرتشی عہد کا آدمی ہو۔ وہ تقدس بھرے محنت کش کسان کو یوں شرف عطا کرتا ہے:

بھیک مانگنے کا پیشہ کسی کے گزر اوقات کا ذریعہ نہیں بن سکتا
جن کے ہاتھوں میں ہل ہوتے ہیں، وہی انسان انمول اور عظیم ہوتے ہیں

ایک اور محنت کش کے بارے میں بھی سنیے، چرواہے کے بارے میں۔ آج کے پنجابی سندھی اور پشتون کے بارے میں تو میں نہیں کہہ سکتا مگر بلوچ تو، یا تو ابھی تک چرواہی گیری میں غلطاں ہے یا پھر اُس کا ابّا، چاچا، دادا چرواہی معیشت میں رہے ہیں۔ حالیہ معاملہ ہے یہ!!۔

اس نے چرواہوں کا تذکرہ بھی بہت تقدس واحترام سے کیا:

چرواہوں نے پیار سے پکارا،
تو موسم بھی تبدیل ہوا، اور برسات برسنے لگی

اور اگر آپ کا خیال ہے کہ وہ مچھیروں ماہی گیروں کا ترجمان شاعر نہیں ہے تو فوراً سہو کا سجدہ ادا کیجیے، اپنے ذہن کو واشنگ مشین میں ڈالیے اور بڑا شعر پڑھیے:

جو عمیق سمندر میں غوطہ لگا کر جاتے ہیں
اور قیمتی صدف کو پاتال سے ڈھونڈ کر لاتے ہیں،
وہ ہی انمول موتی پا سکتے ہیں۔(3)

اگر آپ کا دل سرمایہ داری کی چکا چوند میں گھرا ہوا ہے، اگر آپ کارپوریٹ دنیا کے اشتہار باز جادوگر کے حصار میں گھرے ہیں، اگر آپ خاتون ہیں اور کنفیوز ہیں ''ہم'' ٹی وی کے ڈرامے دیکھ دیکھ کر حُسن اور محبت کے فیوڈل تصورات میں غرق ہیں تو لایئے اپنے ہاتھ: سُر لیلاں چنیسر سے ملایئے، شاہ لطیف آپ کو بکواس تصورات سے نجات نہ دلائے تو جرمانہ مجھ سے لیجیے۔

''جب سے میں نے کانوں میں سونے کے بالے پہنے ہیں، گلے میں خوب صورت ہار ڈالا ہے، بانہوں میں کنگن پہنے ہیں اور خوشبودار تیل لگا کر بال سنوارے ہیں، تب سے میرے محبوب نے مجھے پوچھنا چھوڑ دیا ہے''۔

یا خدا! تُو ایسے محبوبوں کی بہتات کیوں نہیں کرتا!

ذرا غور کریں تو معلوم ہوگا کہ ایک دو دانوں کو چھوڑ کر، شاہ کی ساری ہیروئنیں نچلے طبقات سے ہیں۔ اس کی تذکرہ کردہ عورتوں میں صرف لیلاں اور مومل اعلیٰ طبقات سے ہیں۔ جہاں اُس نے بالائی طبقہ کی خود پسندی اور غرور کو بے نقاب کیا ہے۔ اُس کی سسی شاہ زادی نہیں ایک دھوبن ہے۔ سونہڑیں ایک کمہار، اور ماروی ایک غریب دیہاتی ۔ وہ اِن دھوبیوں ،کمہاروں، لوہاروں، بھٹے والوں، گویوں، اور مچھیروں میں ہر ایک کو تھوڑی تھوڑی راہنمائی اور نصیحت کرتا ہے۔ مگر وہ پنڈت پیر کی طرح تین میل اونچا ہو کر انجانی زبان میں نصیحتیں نہیں بڑ بڑاتا۔ وہ تو اُن کے برابر میں، شانے پر ہاتھ رکھ کر انتہائی شفقت سے اُن کی اپنی ماں بولی میں دوستانہ انداز میں، اپنائیت میں اُن کے کان میں کھسر پھسر کرتا ہے۔ ایسا کہ دل میں اتر جائے۔

شاہ اپنی محنت کش ہیروئن کو عاجزی و انکساری برتنے کو کہتا ہے۔ توقعات نہ باندھ کر سوئے منزل رواں دواں رہنے کا درس دیتا ہے۔ صرف انہیں بیان نہیں کرتا بلکہ وہ محکوم لوگوں کے اتحاد کی علم برداری کرتا ہے۔

سماج میں طبقات اور طبقاتی مناقشے میں دوسرے فریق کی نشاندہی کرنے میں بھی شاہ نے کوتاہی نہیں کی ۔ بالخصوص اُن لوگوں کو تو اس نے رکھ رکھ کر کوڑے مارے جو عام انسان کا جامہ پہن کر، عام انسان کے بیچ رہ کر، بالائی طبقات کے لئے دلالی کرتے ہیں۔ شاہ لطیف کے لیے حکمران اور جاگیردار تو قابلِ نفرت تھے ہی مگر وہ اُن کے ٹکڑوں پر پلنے والے دانش وروں کو بالخصوص بے نقاب کرتا رہا۔ اس سلسلے میں اُسے ملاّ کبھی اچھے نہیں لگے، نہ ہی اُسے پیر بھلے لگے۔ ہمارے اِس حکیم و دانا کی نظر میں یہ دونوں تعصب پھیلاتے ہیں، تنگ نظری پیدا کرتے ہیں۔ وہ خودغرض ہوتے ہیں اور مادی فوائد کی خاطر مذہب کو غلط استعمال کرتے ہیں۔ وہ کتابیں پڑھنے میں مصروف ہیں، مگر اپنے دلوں کو قابو کبھی نہیں کرتے۔ اس لئے جتنا زیادہ وہ پڑھتے جاتے ہیں، اُن کے گناہ اُتنے ہی بڑھتے جاتے ہیں۔

شاہ لطیف ملاّ پر بھرپور تنقید اور طنز کرتا ہے:

ملاّ ملاّ مت کہو، یہ تو صیاد اور شکاری ہیں
خنزیر کے گوشت کے عوض انمول گوہر دے دیتے ہیں

یا.....

وہ جھاگ دیکھ کر ہی پلٹ آئے
گمراہوں بدبختوں نے دودھ تو چکھا ہی نہیں
دنیا کی خاطر دین دے آئے اور بدبخت وقلاش بنے (4)

ویسے بھی یہ آدمی بہت دلچسپ تھا۔ ڈھونڈ ڈھونڈ کر دیکھو شاہ کی پوری شاعری میں آپ کو ماسوائے دو لوگوں کے کسی اور کے لیے بدعا نہیں ملے گی:

ایک ذخیرہ اندوز اور قحط کا ذمہ دار گروہ ہے، اور دوسرا ملاّ

ملاّ کو یوں کہا:

''اے ملا خدا کرے تیری ماں مر جائے،
اور تیرا پتاّ پیٹ کے اندر پھٹ جائے'' (5)

کتنی درد بھری کیفیت ہے پتّے کا پیٹ میں پھٹ جانا۔ لبلبے کا انفیکشن، اپنڈکس کا انفیکشن، یا پتے کا انفیکشن۔

اور دیکھا جائے تو شاہ ملاّ کے خلاف نفرت کو تو عام اور مقبول بنانے میں کامیاب ہوا مگر وہ پیر کو حقیر بنانے میں ناکام رہا۔ سندھ میں ملاّ سمجھو بالکل بے ضرر ہے۔ وہاں تو پیروں کا بچھا جال بہت عوام دشمن اور خطرناک ہوتا ہے۔ یہ بہت استاد لوگ ہوتے ہیں۔ حد تو یہ ہے کہ پیروں نے خود اِس پیر مخالف شاہ کو پیر بنا ڈالا۔ بالکل اسی طرح جس طرح ہندو برہمنوں نے برہمن دشمن مہاتما بدھ کو ہی بھگوانوں کی لسٹ میں شامل کر دیا۔ سندھ کا پیر تو جہالت و توہم پرستی کا اس برصغیر میں سب سے بڑا ایجنٹ ہے۔ اُس سے جان چھڑانے میں تو پوری صدی کی تحریک چاہیے ہوگی۔

اُس وقت کے ایک اور سماج دشمن عنصر کا تذکرہ بھی ضروری ہے۔ یہ عنصر تھا یورپی

سامراج۔حالانکہ پرتگیزی یا انگریزابھی تک قابض نہیں ہوئے تھے۔اور ابھی اکادکا انگریز اور پرتگالی سوداگر ہی نظر آتے تھے،مگر دوربین وبصیرت بھرے شاہ نے اُسی وقت کہا تھا:

ہمارے ناخداؤں کو ہوا کیا
بدل کر بھیس آئے ہیں پھلنگی (فرنگی)
بتاؤ ہے کوئی ملاّح ایسا
کہ روکے یورش دُزدانہ اُن کی

حوالہ جات

1- شاہد حق،ڈاکٹر۔سُر مومل رانو۔پاک عرب ریفائنری لمیٹڈ۔2003۔پیش لفظ۔
2- صدیقی،محمد علی۔ادراک۔2007۔ارتقامطبوعات کراچی۔صفحہ 119
3۔فہمیدہ حسین۔شاہ عبداللطیف بھٹائی۔صفحہ 58
4- رشید بھٹی۔تصوف اور کلاسیکی سندھی شاعری۔2010۔سندھی ادبی سنگت۔صفحہ 62
5- عباسی،تنویر۔طاہر تونسوی کی تالیفی۔کتاب ''لطیف شناسی''2010۔سرائیکی ادبی بورڈ ملتا۔ صفحہ 139

شاہ لطیف کا سماجی ہدف

عمومی طور پر دانش وروں،شاعروں اور فلاسفروں میں ایک کمزوری یہ پائی جاتی ہے کہ وہ موجود اور مروج برائیوں پر کوسنے دیتے رہتے ہیں۔ ہمارے زمانے کے بہت بڑے شاعر علامہ اقبال تک بہت بڑی تعداد عالموں ،فلاسفروں کی رہی ہے جو موجودہ برائیوں کے خلاف بولتے رہے،مگر متبادل نہیں بتاتے۔

مارکس پہلا منظّم فلاسفر تھا جس نے فلاسفروں کے اِس ادھورے پن کی طرف اشارہ کیا۔

شاہ لطیف نے موجود سے نفرت کی،اور برملا نفرت کی۔اُس نے اُس نفرت کی وجوہات بھی بتائیں۔اس کے بڑے فلاسفر ہونے کی نشانی اور خصوصیت یہ ہے کہ اُس نے صرف موجود کو مسترد کر کے لوگوں کو کنفیوز نہ چھوڑا، بلکہ اس نے موجود کو مسترد کرنے کے بعد اُس کا متبادل بھی مہیا کر دیا۔

یہ الگ بات ہے کہ ممکنہ حد تک بھر پور متبادل کارل مارکس نے ہی مہیا کر دیا جسے''سائنسی سوشلزم'' کہا جاتا ہے۔اُس سے قبل تمام لوگوں نے مروج وموجود کو مسترد تو کیا مگر متبادل سماج کی بنیادیں محض اخلاقی یا خواہشی بنیادوں پر استوار کیں۔سب کا خیال تھا کہ رضا کارانہ طور پر،تبلیغ کے ذریعے، یا پھر مثال پیش کر کے انسانوں کو ایک منصفانہ سماج کی تعمیر پر راضی کیا جا سکتا ہے۔چوں کہ رضا کاری والا مفروضہ ہی غلط تھا اس لیے اِن سب کی جدوجہد ناکامی سے دوچار ہوئی۔یہ ناکامی کبھی پر امن نہ ہوئی بلکہ اس ناکامی پہ بہت سارے انسانوں کے خون کی قربانی بھی دی گئی۔مارکس سے قبل کے اِن تمام عظیم انسانوں اور تحریکوں کو''یوٹوپیائی'' کہا جاتا ہے۔شاہ لطیف کا شمار بھی انہی میں ہوتا ہے۔

شاہ کا پیش کردہ متبادل کیا ہے؟ ہر اچھے، نجات یافتہ اور بزرگ انسان کا سماجی ہدف تو بھوک محتاجی سے پاک ایک ایسا سماج ہی ہوتا ہے: جہاں بے انت آزادی میسر ہو، محبت کی آزادی ۔آزادی اور محبت اپنے تنگ معانی میں نہیں، بلکہ سماجی سطح پر اپنے بھرپور پھیلاؤ میں۔ مزدک سے لے کر مسیح تک، مارکس سے لے کر مگسی تک اور لطیف سے لے کر توکلی تک یہی ایک بینر تو تھا جسے وہ اپنے اپنے زمانوں، زبانوں، موسموں، معروضوں کی مطابقت میں زندگی بھر لہراتے ہوئے چلتے رہے۔

یہ تو ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں کہ عشق و محبت کے ساتھ شاہ کے ذاتی مراسم رہے تھے۔ وہ ایسے ویسے زبانی کلامی عاشق نہ تھا بلکہ وہ تو Practicing لَور تھا۔ شاہ نے اِس خدائی نعمت کو خود اپنے جسم و روح پہ جھیلا تھا۔ وہ خود، اپنی بھرپور جوانی میں ایک فیوڈل کی بیٹی کی محبت کے بگولوں میں گھر کر اپنے درخت کے پتے اور شاخیں کھو چکا تھا اور ناکامی پر وہ کوہ و صحرا نوردی میں مبتلا ہو چکا تھا۔ (عام استعمال کا جملہ، وگرنہ محبت ناکام کب ہوتی ہے!!)۔ چھوٹا آدمی نہ تھا کہ اپنے دکھ (تجربے) کو ذات تک محدود رکھ کر قبر میں جاتا۔ ارے بابا، وہ تو عبداللطیف تھا۔ اس نے اپنے سرور بخش اور کیف آور درد کو ایک طرح کا پیغام بنایا اور بھٹ شاہ سے ہنگلاج تک، جونا گڑھ سے لاہوت تک، جیسلمیر سے تھر تک، اور سندھ سے ہند تک، اسے باجرے کے بیج کی طرح بکھیرتا رہا تھا۔ اُس نے ایک ماہر جنگی وزیر کی طرح اپنی شاعری میں استعمال کردہ کرداروں کو اپنا ترجمان بنایا۔ سچی بات یہ ہے کہ سسی پنہوں کی داستان میں سسی کے منہ سے لطیف ہی بولتا رہا۔ سراپا دکھ دکھ کو بیان کر رہا تھا، سراپا عشق عشق کی دہائیاں دے رہا تھا۔ اور سراپا جہد جدوجہد کی تبلیغ کر رہا تھا۔ شاہ منزل دکھا رہا تھا، متبادل بتا رہا تھا۔

اسی عشق اور سفرِ عشق نے شاہ کو ایسی بہت سی نعمتیں عطا کر دیں جن کا حصول ویسے بہت مشکل ہوتا ہے۔ ان نعمتوں میں سے سب سے بڑی نعمت انسانیت کی توقیر ہے۔ اور انسانیت کی توقیر کا ایک ہی مطلب ہوتا ہے: نسلی، لسانی، صنفی اور مذہبی امتیازات سے بلند ہو جانا۔ شاہ اپنے تجربے، اور اپنے زمان و مکان میں رہتے ہوئے اپنے الفاظ اور اپنی ماں بولی میں فرقہ واریت کو پتھر مارتا رہا۔ کسی بھی امتیاز کی بنا پر تنگ نظری، اُس کا سب سے بڑا دشمن تھی:

وہ جوگی، ہنگلاج سے نانی کو چلے

وہ جوشیو کے پیروکار ہیں، انہوں نے دوارکا کی زیارت کی
جن جوگیوں کا رہبر علی ہے، میں ان کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی

ذرا بلوچی کا سیکل ادب میں سے داستان ''شیرین فرہاد'' میں سے چھ مصرعے دیکھیں:

وَشتہ کیغدیں دائیا
فرہاد ژہ بنادرا کانڑے
سندھہ نشتغیں جغدالے
گوشتہ بانکیں شیرینا
دائی تہ مخاں اے تاتا
عاشق چی نغنداں ذاتا

ترجمہ:

معصوم نوکرانی نے کہا:
''فرہاد نسلاً ایک ترکھان ہے
سندھ کا جغدال''
مالکن شیریں بولی:
''اے نوکرانی بے ہودہ نہ بول
عشاق ذات پات نہیں دیکھتے''

یہ ہوتا ہے منشوروں کا اشتراک۔ اپنے اسی وصف کی وجہ سے تو شاہ ہم سب کا راہبر ہے ..... بلوچ کا، سندھی کا، مرد کا، عورت کا، مسلمان کا، ہندو کا۔ اور اُس کا کلام ہم سب کے لیے اس وجہ سے مقدس کلام کا درجہ رکھتا ہے کہ اس نے نسل و عقیدہ سے بلند مقام پر جا کر دنیا کی منظر بینی کی۔

وہ موجود رسوم، اوہام، مکروہات، ممنوعات اور مسلّمات کے سامنے سرخ سیاہی سے سوالیہ نشان بناتا گیا، پھر اُن کے سامنے استرداد کا کراس لگاتا رہا اور آخر میں اپنے تجربات و مشاہدات و مطالعات کی بھٹی سے گزر کر جو نتائج اخذ کیے انہیں متبادل بنایا اور اُسی سوالیہ نشان اور کراس کے بعد انہیں درج کرتا رہا۔ بہت جدلیاتی طریقے سے، بہت استدلالی طریقے سے۔

شاہ لطیف انسانی اخوت پر ایمان رکھنے والا مبلغ ہے۔ اتحاد و اتفاق کے بارے میں تو وہ وطن، عقیدہ، اور مذہب سب سے بالا ہو جاتا ہے۔

؎ کونجوں نے اڑان بھرتے غول ہی کو اپنا وطن بنالیا ہے!

شاہ نے محض ہوائی طریقے سے ردِعمل کبھی نہیں دکھایا۔ اس نے تو زمین پر موجود حقائق کو دیکھا، اُن کے اسباب و علل پر غور کیا۔ مثلاً کوئی بھی حساس ذہن و دل خلقِ خدا کو دکھی نہیں دیکھ سکتا۔ یہی پہلا ردِعمل شاہ لطیف کا بھی تھا۔ پھر تو ناانصافی پر مشتمل سماج میں ہر ظلم و ناروائی روزانہ اس کے ''انکار'' کے دیگ کو گرم کرتی چلی گئی۔.....مگر اس نے انکار میں بالکل بھی جلد بازی جذباتیت نہ کی۔ گنجائش بھی نہ تھی کہ اُس کے (ہم سب کے) استاد کی چلائی ہوئی انصاف کی جدوجہد والی، دنیا کی اب تک کی سب سے بڑی تحریک ابھی ابھی ناکام ہوگئی تھی۔ اور چوبیس ہزار کسان بشمول کمانڈر ان چیف کے قتل کر کے اجتماعی قبروں (گنج) میں دفن کر دیے گئے تھے۔ لہٰذا اِس انقلاب کو کوئی اور طریقہ ڈھونڈنا تھا، بہت بالواسطہ طریقہ، بہت محتاط انداز.....تعلیمات وہی، حکمت عملی بھی وہی مگر داؤ پیچ بدلنے تھے۔ اس لیے کہ جاگیردار، پیر اور سردار بہت ہشیار ہو چکا تھا، تجربات سے بھرا ہوا تھا، اور ریاستی قوت کا مالک تھا۔ اور ابھی حال ہی میں برسرِ پیکار کسان جنگ کو بھگت چکا تھا۔ بالائی طبقہ بہت حساس ہو چکا تھا، اُس کے سارے حِس تیز ہو گئے تھے۔ وہ کسی طرح کا رِسک نہیں لے سکتا تھا.....اور یہ بات اُس طبقے کا دشمن شاہ لطیف جانتا تھا۔

چنانچہ اُس نے بہت ہی بالواسطہ انداز میں ایک طرف ''سٹیٹس کو'' کی قوتوں کی نشان دہی کی۔ اور دوسری طرف انقلابی قوتوں کو شناخت کر کے اُن سے خطاب پر مشتمل اپنی پوری شاعری کی۔ بہت اُستادانہ انداز میں انہیں جدوجہد کی راہ دکھائی، راہ کی مشکلات سے خبردار کیا اور اُن مشکلات پر قابو پانے کی تدابیر بتائیں۔

شاہ کا متبادل نظام کیا تھا؟۔ ایک زرعی معاشرے میں متبادل بھلا کیا ہو سکتا ہے؟۔ وہ تو ٹالسٹائی والا، مست توکلی والا ہی ہو سکتا ہے۔ نیکی اور اچھائی۔ صنعتی معاشرے والے استحصال کے تجربات، کیپٹلزم کی پیچیدگیوں کا ادراک، ایک منظم پارٹی اور ایک مربوط و متشدد جدوجہد کی ضرورت

شاہ لطیف کے زمانے کا معروض تھا ہی نہیں۔ اس کا متبادل تو ایک مدھم و مبہم نئے انسانی سماج کا قیام تھا۔ جہاں ''انسان کے بنیادی حقوق پامال نہ ہوتے ہوں۔ لوگ معاشرتی تفکرات سے آزاد ہوں.....شاہ لطیف کے نزدیک ایسی تبدیلی ناگزیر تھی اور یہی اُس کا سیاسی شعور تھا''۔(1)

شاہ کا ایک اور بھائی بند اور ہم سب کا مرشد حافظؔ کہہ گیا ہے:

مہ بوس جز لبِ معشوق و جام مئے حافظؔ
کہ دستِ زہد فروشاں خطاست بوسیدن

سو، زہد فروشوں کے ساتھ شاہ کی دوستی بھی ختم۔

شاہ لطیف نے بے بس انسانوں کے دلوں میں ایک نئی روح ڈال دی۔ انہیں یاسیت کے گہرے کھڈ سے نکالا، فرد کو جدوجہد کی راہ دکھائی اور اپنی جدوجہد پر امید و یقین رکھ کر رواں دواں ہونے کا سبق سکھایا۔ اس نے دلیلیں دے کر ایسا کیا، مثالیں دیکر ایسا کیا۔ مثلاً اس کے ہاں انسانی بلند اقدار اور انصاف بھرے سورج کے شہروں میں سے ایک کیچ ہے۔ کیچ، جہاں پنوں قید ہے۔ اور سسی اپنے محبوب کی رہائی کا واحد مقصد لے کر اشتیاق و تیقن کے ساتھ اُس جانب لپکتی جاتی ہے۔ سسی کے علاوہ بھی آپ شاہ کے جس کیریکٹر کو دیکھیں وہاں آپ کو شاہ دکھی، مظلوم اور محکوم انسانوں کے لیے امید کا چراغ نظر آتا ہے۔ شاہ امید، شاہ حوصلہ، شاہ جُھد، شاہ اتحاد، شاہ انقلابی، شاہ آزادی، شاہ ترقی پسندی، شاہ آبادی، شاہ اسٹیبلشمنٹ مخالف، شاہ انسانیت..... شاہ نے اپنے جادو بھرے کلام کے ذریعے فرد کو جینے اور اپنے حقوق لینے کے لیے تیار کیا اور اس میں یہ جذبہ بیدار کیا کہ وہ ظلم کے خلاف نہ صرف آواز اٹھائے بلکہ ظالم قوتوں کے سامنے سینہ سپر ہو جائے۔

وہ ہمارے لیے ایک یوٹوپیائی مستقبل دیکھتا ہے، ایک روشن مستقبل:

کوئی پابندیاں نہیں، کوئی بندشیں نہیں
وہ آزادانہ بازو بھر بھر کر سرخ حسین پھول لاتے ہیں
قیمتی لوگ ہیں یہ، اپنی سرزمین پہ نازاں اور سرزمین اِن پہ نازاں

میرا جسم زنجیروں میں جکڑا ہے،
ساری رات میں آزادی کے لیے کُوکتی اور فریادیں کرتی ہوں

شاہ کسی کو بھی تقدیر کے حوالے نہیں چھوڑتا۔ وہ اس سوچ کے ہی خلاف ہے کہ بس بیٹھے رہو تا وقتیکہ روٹی کا ٹکڑا آ جائے اور تم کھالو۔ وہ تو اندر باہر کی تبدیلی کا فلاسفر ہے۔ ہمت بڑھانے والا، کام پہ اکسانے والا۔

شاہ لطیف خالی خولی دعوے کرنے اور بڑی بڑی باتیں بنانے والوں کو اپنا معیار نہیں بناتا۔ وہ تو جدوجہد میں کود جانے والوں کو معیار ٹھہراتا ہے:

جاڑے کی سرد اور اندھیری رات میں،
سخت بارش کے درمیان جو دریا میں کود گئی تھی
چلو اُس سے چل کر پوچھتے ہیں کہ محبت کیا ہوتی ہے؟
کیوں کہ وہی جانتی ہے کہ محبت کیا ہوتی ہے،
اور وہ ہی ہے جس کے من میں دن رات میہار ہوتی ہے

وہ اپنی دھرتی کی دانش ورانہ دنیا کا تخلیقی جینیس ہے۔ وہ زندگی کا شاعر ہے، زندگی کی میٹھی کڑوی حقیقتوں کا شاعر ہے۔ جذبات اور احساسات کے ساتھ ساتھ خیال اور فکر اُس کی شاعری میں اعلیٰ درجہ کے ہیں..... المختصر شاہ لطیف لولاک کے سچ اور حق اور حسن اور انصاف کا ترجمان ہے۔ وہ ہماری دھرتی اور اس کے باسیوں کا شاعر ہے۔ وہ متبادل مہیا کرنے والا شاعر ہے۔

حوالہ جات

1- پریمی، موہن لعل۔ طاہر تونسوی کی مرتب کردہ کتاب ''آئینہ خانۂ شاہ لطیف۔ 2012 محکمہ ثقافت حکومت سندھ۔ صفحہ 105

عشق آساں، نمود اول.....

جیسے کہ ذکر ہو چکا کہ شاہ لطیف کا زمانہ شاہ عنایت کی تحریک کی ناکامی کے فوراً بعد کا زمانہ تھا۔ دوسرے لفظوں میں یہ عوام الناس کی طرف سے مسلسل جدوجہد اور لڑائیوں کے بعد پسپائی اور شکست کے بعد کا زمانہ تھا۔ پیر اور جاگیردار جیت چکے تھے۔ اُن کی طرف سے جنگ کے بعد کی نیچ اور وحشی انتقامی کاروائیاں جاری تھیں۔ ظاہر ہے کہ یہ ایک دہشت و بربریت والی فضا تھی۔ گھپ خموشی کی فضا۔ جمود ایسا کہ آثارِ زندگی مفقود۔

ایسے میں تو کسی فہمیدہ اور دوراندیش عوامی دانشور کی ذمہ داری کئی گنا بڑھ جاتی ہے۔ چیلنج کیا تھے؟۔ عوام کو اعتماد بخشنا، ان کے اتحاد و جہد کی روایتوں کو پانی کھاد دیتے رہنا، اُن کی صفیں دوبارہ منظّم کرنے کی بہت ہی محتاط تدبیریں کرنا، انہیں اصل منزل کے پہچاننے میں مدد دینا، راستے کی مشکلات سے آگاہی مہیا کرنا.....

اور وہ ذمہ داری آسمانوں نے شاہ لطیف پر ڈال دی۔ شاہ لطیف ساری عمر اُن سب سماجی ذمہ داریوں کی برآوری میں جُتا رہا۔ اس نے کوئی آرام، بے پرواہی اور غیر ذمہ داری نہ دکھائی۔ کمال یہ ہے کہ اس نے تنظیم کے بجائے تحریک کے لیے کام کیا۔ اس نے ''منزل'' کو اور ''مقام'' کو دو الگ الگ اصطلاحات قرار دیا۔

اُس کا سارا زور اس بات پہ تھا۔ کہ راستہ بہت دشوار ہے، پہاڑ بہت ڈھلوان ہیں، ایسے میں خوراک کے کوئی انبار ساتھ نہیں لیے جا سکتے۔ قربانی ہی قربانی ''حال قربان، مال قربان'' (شاہ)۔

کتنی عجیب بات ہے کہ کیچ تو عام سا کیچ ہوتا ہے، زمین کا ایک ٹکڑا۔ ملیر تو عام سا ملیر ہوتا ہے ریت مٹی ہوا، لوگ، جانور، پہاڑ، ندی۔ عام سا علاقہ۔ مگر اب ہمارے والا کیچ، ہمارے والا ملیر منزل بن چکے تھے۔ اب ہر نیک تمنا، اچھی خواہش اور دنیا کی بہترین شئے وہیں سے منسوب تھی۔ وصل کی منزل تھی۔ وصل جو برابری کی حتمی کیفیت، کمیونزم کی بلند ترین حالت ہوتی ہے۔ شاہ لطیف نے اس منزل کو جسمانی سے زیادہ فلسفیانہ بنا دیا۔ (اور یہی تو ایک دانشور کی دانش کا گز ہوتا ہے)۔

اُس نے یہ کمال بھی کر دیا کہ مقامی کو جہانی بنا دیا۔ مخصوص کو عمومی کر دیا، اور فوری کو ابدی بنا دیا۔ شاہ نے ''شارٹ کٹ'' لفظ کا گلا گھونٹ دیا۔ دیکھیے ناں، اُس نے کیچ کو صرف سسی کی منزل نہیں رہنے دیا، اس نے تو اُسے عالم انسانیت کی نجات کی حالت بنا دیا۔ اس نے کیچ کو محض جغرافیائی خطہ رہنے نہ دیا بلکہ اسے ایک خیال، ایک آدرش، ایک استعارہ بناڈالا۔ اب وہی کیچ زاہد کا مندر تھا، مچھیرن کا ملیر تھا، مظلوم کا ماسکو تھا، ایک ضرب المثل ایک مصرع ایک نعرہ تھا، ایک محاورہ ایک ورد تھا، شاعر کا دیوان، نجات کے کارروان کا سرخ جھلملاتا ستارہ بن چکا تھا۔

جب یہی عام سا کیچ یہی عام سا ملیر کسی کی منزل بن جاتے ہیں تو اچانک یہ جگہیں بے شمار دشواریوں، کٹھنائیوں اور مشکلات کا سمبل بھی بن جاتی ہیں.....اور یہ کتنی دور ہو جاتی ہیں۔ راستہ تنہا، بے آب و گیاہ۔ راہگذر خم بہ خم، تپتا کیچ ڈگر۔ تہہ در تہہ دشواریوں اور جبر و ناروائی سے بھری زندگانی کے ہزاروں مرحلے ہیں اور ہر مرحلہ پچھلے مرحلے سے سخت تر ہے جہاں دانا، اپنی دانائی بھول جائے، جہاں عالم کا سر گھوم جائے۔ تو سماجی تبدیلی کے لیے کوشاں لوگو! کیچ جانا ہے، دور افتادہ کیچ، شاہ لطیف کا ضرب المثل بنایا ہوا کیچ۔ جہاں منزل ہے.....اور منزل رسیوں سے بندھی ہے۔ رسیاں زور آور سردار و حاکم کی ہیں۔ اپنی اِس منزل کو آزاد کرانا ہے۔

کئی لوگ انقلاب اور انقلابی عمل کو آتش و لہو سے جدا رکھنے کی بات بھی کرتے ہیں مگر شاہ لطیف اصل کو اصل، نقل کو نقل کہنے والا دانشور ہے۔ وہ اپنی شاعری میں گل گلاب اور چہکتے چکوروں کا دلفریب ذکر نہیں کرتا۔ وہ تو غریب دیہاتیوں کے بھوکے پیٹ کی غراہٹ گاتا ہے، صحرا چرتے اونٹوں کے دانتوں کی آواز ریکارڈ کرتا ہے، بھینس کے بچھڑے کا چڑا ادھیڑنے والی صحرائی ریتلی

ہواؤں پر شان والی بارش برسنے کی بات کرتا ہے۔ وہ بدحال عاشقوں کی فریادوں کو محبت کے اپنے نغمے بنا دیتا ہے۔ وہ کوئی شوگر کوٹڈ دوائی نہیں کھلاتا، سیدھا سیدھا کہہ دیتا ہے کہ:

؎ محبوب کے بغیر سونہڑیں تو ناپاک ہے

اور محبوب سونہڑیں کو طشتری میں رکھ کر پیش نہیں کیا جانا۔ وہ بغیر کسی اگر مگر کے سیدھا سیدھا کہہ دیتا ہے:

؎ محبت کے میدان میں سر کی پرواہ نہ کر

یہ بھی کہ، منزل کی راہ میں کہیں نہ کہیں کوئی عیار و شاطر ''ناتر'' ہوگی۔ راہ میں بھول بھلیاں لازمی ہوتی ہیں، طلسمی تالاب، خوفناک شیروں سے مڈبھیڑ، زہر آلود خوراک، پراسرار چشمے، جھولوں کے نیچے غار اور غاروں میں چمکتی ہوئی تیز برچھیاں اور دیگر ہیبت ناک مناظر اور.....اور اگر یہ سب کچھ عبور کر کے مومل مل بھی جائے تو ہمیر سومرو کی بدبودار انا، جھوکوں سے حاصل کردہ بیش بہا نعمت کو پھر ناراض کر دے۔ منزل نے کتنی چتاؤں کا انتظام کر رکھا ہوتا ہے۔ انقلابیوں کے لیے کوئی سجی سجائی منزل نہیں ہوا کرتی۔

اُدھر شاہ کی سسی کیوپڈ کی طرح تیر کمان سے لیس نہیں ہے۔ شاہ کمال ہنرمندی سے ''موضوع کو'' ہمیشہ بے سامانی یا، کم سامانی میں ہی کھڑا کرتا ہے اور وہ پھر ''معروض'' کو اپنے حق میں بدل کر رکھ دیتا ہے۔

مگر شاہ نے پہاڑوں کو مخاطب کر کے کہا تھا کہ تمہاری حدت ایک پہلے سے دکھی عورت کا کیا بگاڑ سکتی ہے۔ اگر تم پب کے پتھر ہو تو سسی کا بدن بھی لوہا ہے۔ وہ عورت نہ کٹھن راہوں سے بددل ہوتی ہے، اور نہ درندوں سے ڈرتی ہے۔ شاہ اُسے تلقین کرتا ہے کہ اے مصیبت زدہ، نہتی، کمزور عورت! اخلاص سے قوت پکڑ، کوہستانی پتھروں سے خود کو پکالے، اور کندن بن جا.....اور وہ کندن بن کر دکھاتی ہے۔ وہ ناتراشیدہ، دشوار گزار اور بلند پہاڑیوں کو للکارتی ہے کہ او نیچے پہاڑ میرے سامنے سے ہٹ جا' ورنہ تجھے ذرہ ذرہ رتی رتی کر دوں گی۔ تو بڑا ہے تو میرا عزم تجھ سے بھی بڑا ہے۔

شاہ گرمی سردی میں شدید جدوجہد کا کہتا ہے، آرام کے لیے تو کوئی مہلت ہے ہی

نہیں(1)۔اس لیے سسی کو راہ گزاروں سے بدگمان نہیں ہونا۔کیچ جانا ہے تو پھر آوارگی کیسی؟۔حتمی منزل تو معلوم ہے۔اور اگر جانا کیچ ہے تو پھر غرور کیا، کبر کیا۔''کر'' کیا،''فر'' کیا؟۔کیچ کے سفر میں تو برہمن زادی عاجزی نامی گائیڈ کو راہنما بنائے گی کہ مسلکِ عشق کی شان، درویشی ہے۔وہ تو ویسے ہی توہین وہتک کی مقتدی ہے۔

اِس دانش ور نے حد کردی۔دیکھیے ناں اگر کیچ جانا ہے تو دنیاوی سنگی سہیلیاں پاؤں کے چھالے بن جاتی ہیں۔عشق کی مسافرت میں سہیلی نہیں، کمٹ منٹ چاہیے ہوتی ہے، جنون چاہیے ہوتا ہے۔بیابان کیچ، ویران ٹیلے، پہاڑیاں، چوٹیاں، ٹھوکریں، ہانپنا کانپنا، چھالے، بھوک، پیاس سب منظور۔عشق کسی خودفریبی کا متحمل نہیں ہوتا۔شاہ لطیف تم سدا دلوں میں زندہ رہو گے!۔

سفر کی یہ کٹھنائیاں دشواریاں اس قدر مزیدار ہوتی ہیں کہ کچھ لوگ منزل کا تصور ہی بھول جاتے ہیں اور سفر کے ہی ہو کر رہ جاتے ہیں۔انقلاب نامی منزل اُن کا دروازہ بھی کھٹکھٹائے تب بھی یہ سفر کے سرور سے باہر آنا نہیں چاہتے۔وہ پارٹی ورکری میں زندگی گزار دیتے ہیں۔اور یوں تبدیلی کا یہ علم بردار خود تبدیلی کو اپنے نشے میں مداخلت گردان کو روک دیتا ہے۔

مگر شاہ لطیف ایسا کرنے نہیں دیتا۔شاہ لطیف کو اپنی اس منزل سے اس قدر پیار ہے کہ وہ کہہ اٹھتا ہے کہ''اگر میری آنکھیں''اُس''(منزل) کے علاوہ کوئی چیز دیکھیں تو میں انہیں اس طرح کھرچ پھینکوں گا جس طرح کوے پرنوالے توڑ کے پھینکے جاتے ہیں''۔شاہ سفر کے نشے کو حصولِ منزل کے عظیم مقصد پر حاوی ہونے نہیں دیتا، کبھی نہیں۔

مگر یاد رکھنا منزل پنہوں ہے۔پنہوں (منزل) کے برابر کسی اور کو مت جانو کہ عشق میں شرک کی سزا قیامت کا انتظار نہیں کرتی۔ذرا سی توجہ بٹ گئی تو عشق کی چوکڑی بھرتی خوبصورت ہرن ملاّ شور بازار کے گھڑ سواروں کے سُموں کے حوالے ہوگی۔

بلاشبہ انسان دوستی کے لیے بنیادی شرط ہے ہی انسان دوستی۔اس مقصد کے بغیر کیا منزل ،کیا راستہ، اور کیا زادِ راستہ؟۔جس کو عشق نہیں ہے وہ''وندر'' کیسے جائے گا، اور جن کا عشق خام ہے وہ راہ میں ہی رہ جائیں گے۔

لہٰذا سب سے ضروری چیز تو عشق اور کمٹ منٹ ہے۔اُس کے بعد راہ ہے۔راہ اپنے ''فل پیکج کے ساتھ''۔راہ کے اپنے رواج، ضوابط وقوانین ہوتے ہیں۔یہ بالکل ہی الگ سائنس ہوتی ہے .....اور اگر کمیٹڈ انسان اپنی راہ سے ذرا سا بھی للچایا تو نولکھا ہار بے شک پہنے مگر اُسے، اُس کے حسن کو، اُس کے ہار بردار سینے کو، دیکھنے اور توصیف کرنے کوئی چنیسر موجود نہ ہوگا۔

اور پھر سالک تو تماچی کی نوری ہوتی ہے۔اُسے کیا دکھاوا کرنا ہے، کیا سولہ سنگھار کرنا ہے۔جو ہے روح ودل سے ہے۔عاشق تو عاشق ہوتا ہے اس کے لیے کیچ کی شہزادگی سے بھنبھور کا دھوبی بننا زیادہ قیمتی ہوتا ہے۔

شاہ نے اپنے اردگرد موجود معروضی صورتحال کو بہت خوبصورتی سے بھانپ رکھا تھا۔یہ حقیقت بتادی تھی کہ آپ منزل کو اغوا نہیں کر سکتے۔اسی طرح آپ پنہوں، اور ماروی نامی منزل کو خرید بھی نہیں سکتے، کسی اور ناپسندیدہ ذریعے سے حاصل نہیں کر سکتے۔اسی طرح آپ کو بذاتِ خود اسباب وعلل کی طرف سے اُس کے لیے متعین کردہ پراسیس سے گزرنا ہوتا ہے۔

نیز منزل کسی عمر کے عمرکوٹ کے شاہی محل میں پابہ زنجیر ہو کر نظر بند ہونے کی چیز بھی نہیں ہوتی۔جس نے بھی اسے حقیر جانا، یا اُس کی بے عزتی کی اس کی دنیا وعقبیٰ دونوں غارت ہوئے۔منزل عمرکوٹ نہیں آتی، عمرکوٹ کو منزل (ملیر) جانا پڑتا ہے۔دھکتی آگ سے گزر کر اپنی پاکی ثابت کرنا ہوتی ہے۔

وہ نہ جن بھوت سے ڈرتی ہے، نہ چھپکلی اور ناگ سے

اور بجل تو ہمیشہ''سخی سے دان میں اُس کا سر مانگتا ہے''۔اور ڈیاچ حیرانی سے اتنا ہی کہتا ہے،''تو نے مانگا بھی تو میرا سر مانگا۔بھلے آدمی! اِن چند ہڈیوں سے تجھے کیا حاصل ہوگا؟''۔

خبردار رہیے کہ شاہ اور سسی معروض کے غیر موافق ہونے کا رونا نہیں روتے، وہ تو اپنی صفوں کی ترتیب میں موجود خامیوں پہ تنقید اور اصلاح کرتے ہیں؛

اے سسی تم پاؤں پھیلا کر سو کیسے گئیں یہ تو تم نے بہت بڑا ظلم کر دیا
اگر جاگتی رہتیں تو دروازہ کے پاس ہونے والی کھسر پھسر سن لیتیں

''اوہ محکوم و دکھیو، آؤ مل بیٹھیں اور دکھ آپس میں بانٹیں ۔ آؤ ہم اپنے غم کی یاد کو مل کر تازہ کریں، جو کہ مشترک ہے............'' شاہ اچھے انسانوں کو ان غریبوں کا خیال رکھنے کی تلقین کرتا ہے جو جھگیوں، صحراؤں، مطب جاہوں اور جیلوں میں پڑے ہیں۔ وہ انہیں بھوک، افلاس، بیماری کو ختم کرنے کی سنجیدہ مہم شروع کرنے کی تلقین کرتا ہے۔شاہ ان لوگوں سے اپنی نفرت نہیں چھپاتا جو انسانوں کو جاہل ومحتاج رکھتے ہیں، تعلیم سے محروم رکھتے ہیں۔

شاہ کی ہیروئن اس بات کا انتظار نہیں کرتی کہ اس کی پارٹی کی شاخیں ہر ضلع میں قائم ہوں گی تو وہ جلسہ جلوس کرے گی۔ نہ وہ اس بہانے پہ بیٹھی رہتی ہے کہ اسے کوئی تھنک ٹینک آئین و منشور لکھ کر دے تبھی وہ آگے بڑھے گی۔ وہ ملاّ سے سبق یاد کرنے کے بجائے محبوب سے وصل کرنے کی جدو جہد کو ترجیح دیتی ہے۔ اُس کو تو سب کچھ معلوم ہے۔طلب و تلاش کا مرکز بھی معلوم، سببِ تکالیف والم بھی معلوم، اور راہبر بھی معلوم۔

شاہ لطیف پنہوں کے نقش پا پہ چلتے رہنے کے اِس عمل کو ''وَڈو طالع'' قرار دیتا ہے، وہ اُس کے لیے سسی کو ''رویورویورؤ'' کا کہتا ہے۔

کوسوں تک منزل، (پنہوں) کا کوئی نقش پا نہیں ملتا۔ مگر اسے تو بڑھتے ہی جانا ہے۔ کیچ کی جانب کہ کیچ تو سمت ہے، قبلہ ہے۔ کیچ تو سرخ ستارے کی سرزمین ہے، کیچ تو روشن مستقبل کا دیس ہے۔ کیچ جس کا بھید آج تک کسی نے نہ پایا............اور بلوچستان کے پہاڑ! یہ پہاڑ تو سدا سر بلند ہی رہیں گے کہ انہیں تو لطیف نے دعا دی تھی، کہ پہاڑ منزل کا راستہ دکھاتے ہیں۔

لطیف اے کوہساراں پہ دعا کں
کہ راہ سسی آ کیچئے پیش داشتنت
ابدسرسبز و آباداں بمانت
کہ مہر ئے دائمیں تو حمئے آ کاشتنت

(ترجمہ: گل خان نصیر)

اے میرے اچھے لوگو۔ شاہ کا اپنے ہر مخاطب کے لیے یہ پیغام ہے کہ انقلاب، آزادی

اور عالمگیر محبت کے نشانِ منزل تک ہر صورت پہنچنا ہے ۔ چلتے رہو۔ ''عاشقی صبر طلب اور تمنا بے تاب'' تم چلتے ہی رہو جب تک زندگی ہے چلتے رہو، چلتے رہو جلتے رہو، ٹھوکر کھا کر اکڑتے رہو۔ چلتے رہو، قحط ہو یا برسات' سرما ہو یا گرما چلتے رہو۔ مسلسل اسی سفر میں رہنا ہے اور اپنی منزلِ مقصود تک ہر حال میں پہنچنا ہے (حسینی 2-7)۔ چلتے رہو............

اگر پیروں میں طاقت نہ رہی اور چلنے سے معذور ہو گئے تو گھٹنوں کے بل
آؤں گی
اگر گھٹنے گھسنا چھوڑ دیں تو کمر کے بل آؤں گی
اگر کمر بھی ٹوٹ گئی تو سینے کے بل آؤں گی
اگر سینہ بھی ہلنا بند کر دے تو ہاتھوں پر چل کر آؤں گی
اگر ہاتھوں نے جواب دیا تو آنکھوں سے آؤں گی
اگر مل گیا تو زہے نصیب جو نہ مل سکی تو سمجھوں گی اس پر قربان ہو گئی

اس نے ایک باکمال اور ماہر سٹرٹیجیشن ہونے کا ثبوت دیا۔ ہوچی منہ سے سیکڑوں سال قبل والا لطیف جانتا ہے کہ عشاق کی راہ روکنے والے دشمن ہیپٹائٹس ''سی'' اور ایڈز کے وائرس کی مانند بہت چالاک ہوتے ہیں۔ لمحہ بہ لمحہ شکل و خاصیت بدلتے رہتے ہیں۔ تو اُس کے خلاف کیسے لڑا جائے؟ ۔اس کے لیے تو آپ کو بھی غضب کا پھرتیلا بننا ہوگا۔ شکل وصورت بدل بدل کر حملہ آور ہونا ہوگا۔

کبھی کان بن جاؤ اور کبھی کلام
کبھی چھری بن جاؤ تو کبھی بکرا

ہمارا یہ فلاسفر مصلحت پرستی اور مصالحت پرستی کے سخت خلاف ہے۔ اُس کی نظر میں ''بڑے عزائم کے دکھ بھی بڑے''۔ اور جو بڑے ارادے باندھتے ہیں وہ ''تنہا رہ جانے'' کے خوف میں پگھل نہیں جاتے۔ جہنم میں جائے رائے عامہ، اگر آپ ''رائے'' کے مالک ہیں تو تنہائی آپ کا مقدر ہے، عمومی دھارے سے الٹ چلنا آپ کی پہچان ہے:

اگر تمام لوگ ڈھلان کی طرف بہتے جا رہے ہوں تو بھی
تم اپنا سفر بہاؤ کی مخالف سمت میں بلندی کی طرف جاری رکھو

وابستگی آپ کو کمہار سے برتن خرید و اخرید و اکر کنگلا کر دیتی ہے، اور پھر آپ اسی ''وابستگی'' کے گھر ملازم ہو کر اس کی بھینسیں چرانے پہ لگ جاتے ہیں۔ ناقابلِ تصور مصائب اور چکرا دینے والی بے توقیریاں، قربانیاں.....

اور جب آپ کامیابی سے ایسا کرتے ہیں تو منزل آپ کی ناز برداری میں لگ جاتی ہے۔ منزل خود اندھیری رات میں گھڑے کے سہارے سر دریا پار کر کے آتی ہے اور تمہیں وصل کے سرور سے نوازتی ہے۔ منزل جو خود تو راحت ہوتی ہے، تسکین و فرحت ہوتی ہے..... یہ تو بس راستے کو ہیبت ناک بناتی ہے تاکہ ہر ایرا غیرا نہ آ سکے۔ بس، سب سے مناسب و موزوں شخص ہی اس کا روادار ہو جائے.....ڈارون کا Fittiest!!۔ شاہ لطیف کا fittest!!۔

اور پھر منزل والی دنیا ہم آپ والی یہ دنیا تو ہوتی نہیں۔ اِس لیے ہم آپ اس کی نعمتوں کا اندازہ ہی نہیں کر سکتے۔ تماش بین، فتح کا وہ لطف تو لے نہیں سکتا ناں جو مقابلے میں شامل کھلاڑی لے سکتا ہے۔ خیر و شر کی لڑائی جتنی جانکاہ، جتنی پُر لطف ہوتی ہے، اُس کا نتیجہ بھی اتنا ہی ہولناک اور پُر کیف ہوتا ہے۔ تین نتائج نکل سکتے ہیں:

یا تو راہی برباد ہو جاتا ہے،
یا.....منزل سر ہو جاتی ہے،

اور یا پھر..... راہی و منزل دونوں یا تو دھکتی آگ کی چتا کی اوٹ پاتے ہیں، یا طوفانی دریا کی لہروں میں چُھپ جاتے ہیں اور یا' لسبیلہ میں ایک ہی قبر میں پردہ کرتے ہیں۔

حوالہ جات

1۔ کنا سرو، منظور احمد۔ Legacy of Shah Latif۔ 2007۔ کلچرل ڈیپارٹمنٹ حکومت سندھ۔ صفحہ 108

عورتیں سماجی تبدیلی کی سپاہ ہیں!

مجھے یہ باب لکھتے ہوئے خصوصی مسرت ہو رہی ہے۔ بات یہ ہے کہ آج سے بارہ، پندرہ، قبل جس وقت میں نے ''بلوچ سماج میں عورت کا مقام'' نامی کتاب لکھی تھی، اور میر غوث بخش بزنجو کی بایوگرافی لکھی تھی، تو اُس وقت میں نے شاہ کو اس قدر غور سے نہیں پڑھا تھا۔ اور اپنے محدود علم و مشاہدہ کے تحت میں نے عورتوں کو ''انقلاب کی فوج'' لکھا تھا۔ آج شاہ لطیف پر لکھ رہا ہوں تو لگتا ہے کہ اس کا ایک ایک مصرع میری اُس خود ساختہ ''دریافت'' کی پیٹھ تھپکا کر تصدیق کی سند عطا کر رہا ہو۔ اس معاملے میں جو واضح اور دوٹوک مؤقف اس دانشور نے چار سو سال پہلے لیا تھا، میرا اکیسویں صدی والا مؤقف اس کے ''گھوڑے کی پیدا کردہ گرد'' تک کو نہیں چھو سکتا۔ اِس حقیقت کو ضرور مدنظر رکھیں کہ جو کچھ ہم آج کی ترقی یافتہ دنیا کے شعور کے ساتھ لکھ رہے ہیں وہ اُس نے چار صدیوں قبل کے سندھ و بلوچستان کے فیوڈل اور قبل از فیوڈل معاشروں میں بیٹھ کر کہا تھا!۔

سماج کمال کی چیز ہے۔ پاس دلیل ہو، رویہ اپنائیت والا ہو، خود کو ذمہ داری میں مکمل شریک گردانا جاہے اور ہمدردی و ملائمت کے ساتھ سخت سے سخت معاملہ بھی اٹھایا جائے تو سماج مثبت ردعمل کرتا ہے۔ دیکھیے نا، شاہ لطیف نے کہاں کہاں سماجی رواجوں کے برخلاف کام نہیں کیا؟۔ ہم تصور بھی نہیں کر سکتے کہ وہ سونہڑیں کے لیے اُس عمل میں کامیابی کی دعا کر رہا ہے جو سماج کی نظروں میں پکا پکا ''سیاہ کاری'' کا عمل ہے، ''بے غیرتی'' کا عمل ہے۔ مگر اس کے باوجود سماج نہ صرف یہ کہ اُسے کچھ کہتا نہیں بلکہ الٹا پیر و مرشد بھی بناتا ہے، بنائے بیٹھا ہے۔

میں اور آپ یہی بات چار سو برس بعد، آج بھی کر لیں تو سماج ہمیں بھون کے رکھ دے گا۔ خود میں نے جب عورتوں کے بارے میں کتاب لکھی تھی تو ناخواندہ تو بجائے خود، پڑھے لکھے دانش وروں تک کے بال مجھ پر حملہ کرنے کھڑے ہو گئے۔ (اندازہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ کا شُکر رہا کہ دانش وروں کے پاس کوئی فوج، کوئی جتھا، اور کوئی باڈی گارڈ نہ تھے۔ ورنہ تو میرا نرخرہ ٹکڑے ٹکڑے کر دیا جاتا)۔ حالاں کہ میں نے تو اس کا عشرِ عشیر تک نہ لکھا تھا جو شاہ سائیں نے کہا تھا۔ اور پھر، میں نے غور کیا اور بلوچ دانش وروں کا غصہ اور بھڑک جانا میری سمجھ میں آ گیا۔ تب مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ سچ بات کرنا الگ بات ہوتی ہے، اور سچ کی تپسیا کر کر کے، سچ کی ریاضت کر کر کے، سچ بھگت بھگت کر سچ بات کہنا الگ بات ہوتی ہے۔ بے ریاضت کے، بات میں تاثیر نہیں ہوتی۔

شاہ کا کمال یہ ہے کہ اس نے زندگی اور زندگانی کو عورت کے زاویہ نگاہ سے دیکھا اور پیش کیا ہے۔ وہ عورتوں کی زندگی کی تفصیلات بیان کرتا ہے، اُن کے مسائل کو قلم بند کرتا ہے، مسائل کا حل دے دیتا ہے اور اس حل کی جانب پیش قدمی کرنے کی راہ اور ہدایت کرتا ہے۔ ہم محترمہ درِشہوار سے یہ بات ادھار لیتے ہیں جس نے حساب لگا کر بتایا کہ بھٹائی کے ''رسالو'' کے تیس سروں میں سے اٹھائیس سروں میں بالواسطہ یا بلاواسطہ عورتوں کا ذکر آتا ہے۔

شاہ کی سسی ''صنفِ نازک'' اور ''ضعیفہ'' جیسے حقیر القابات کو عشق کے سیلابی سندھ میں بہا دیتی ہے۔ وہ ایک مکمل انسان بن کر اپنے حق کے حصول کی جدوجہد میں جُت جاتی ہے۔ کیا پردہ، کیا چادر، کیا چار دیواری؟۔ ویسے بھی ایسے فیوڈل الفاظ کا اطلاق محنت کش دھوبنوں پہ نہیں ہوتا۔

شاہ کی ہیروئن صبر و شکر کو جہد کے پیروں تلے روندتی ہے۔ وہ جس کی ہے وہ اُسے ہر صورت میں چاہیے۔ چنانچہ وہ سارے مروج پرلاحول پڑھتی ہوئی گھر سے باہر نکل پڑتی ہے۔

شاہ لطیف عورت کے کردار میں گورکی کے پاویل کی ماں کا کردار بھی ڈال دیتا ہے اور ہاورڈ فاسٹ کے ناول 'ٹام پین کی محبوبہ کے کردار کو بھی۔ آپ نے جدوجہد کے باب میں انقلابیوں کی سوانح عمریاں سنی ہوں گی، بے شمار ناول پڑھے ہوں گے، عبرت کی بے شمار داستانیں سنی ہوں گی، مگر بھلا کبھی آپ نے سنا کہ پریم پجارن اپنا تن من کچھ اس طرح بھینٹ چڑھانے پر تیار ہوتی

ہے کہ اپنے جسم کا گوشت کیچ کے کووں کو کھلانے کا عزم کرے۔ شاہ لطیف اُس برہمن زادی کو ٹکڑے ٹکڑے ہونے کو کہتا ہے تا کہ ''کیچ'' (کاز) کے کتے اُسے کھالیں۔ ..... یہ سچ ہے کہ فرید الدین عطار کے منطق الطیر میں بھی جدوجہد بہت کٹھن اور تکلیف دِہ ہے، وہاں بھی جسم و جاں کو تباہ کرنے والی مشکلات ہیں۔ اور ہم اُس جدوجہد کی ایک ایک سیڑھی کے سامنے اپنا سرِ تعظیم خم کرتے ہیں۔ مگر عطار کی سسی اکیلی نہیں ہے، وہاں تیس کی ایک جماعت ہے۔..... ڈائیلاگ اور مونولاگ میں بہت فرق ہوتا ہے۔

شاہ کے مجموعہ میں کُل تیس سُر ہیں جن میں سے سولہ سُر صرف عورتوں کے کرداروں کے نام سے وابستہ کیے ہیں۔ بعض سُر تو شروع ہی عورت کے نام سے ہوتے ہیں جیسے مارئی، سسی، لیلاں، سوہنڑیں، مومل، سورٹھ وغیرہ۔ یہاں اس نے ایک طرف تو عورت کی عظمت واضح کی اور دوسری جانب شعوری طور پر جاگیردارانہ اقدار پر ضرب لگانے کے لیے اِن کرداروں سے کام لیا۔ جاگیرداری، جہاں عورت ایک ثانوی حیثیت رکھتی ہے۔ جہاں اس کا شمار زندہ انسانوں میں نہیں بلکہ اشیاء میں ہوتا ہے۔ وہاں شاہ نے عورت کو فائٹر باشعور بہادر بنا کر اُسے اس جاگیرداری سے ٹکرا دیا۔ وہ اُس کی وفاداری، محبت، تلاش، مستقل مزاجی، قوتِ برداشت، خود اعتمادی اور جذبہِ جہد کی بڑی قدر کرتا ہے۔ وہ گلاں نامی ''گانے والی'' سے نہ صرف شفقت کرتا ہے بلکہ اُس کے فن کی قدر کرتا ہے۔ اسی طرح وہ اپنے کلام کی حافظہ مائی نعمت کی تکریم کیا کرتا تھا۔ معمر عورت، لال بی بی بھی، عزت و احترام کی پیاس بجھنے کے سبب وہیں دربار کی ہو رہی۔ (یسوع مسیح کی ویرونیکائیں)۔

شاہ لطیف خود کہیں سسی بن جاتا ہے، کہیں نوری، کہیں ماروی، مومل، سوہنڑیں، لیلاں اور ہیر ہے۔ ایسا محض لگتا نہیں بلکہ ایسا ہے اصل میں، کہ ہر جگہ ''ادیوں'' کا لفظ استعمال کر کر کے وہ خود کو بھی مؤنث کا صیغہ عطا کرتا ہے۔

شاہ عورت کی بغاوت کا نام ہے۔ اس نے عورت کو ایسے متحرک اور فعال کرداروں کی صورت میں پیش کیا کہ ہم بقول نعیم نقوی ''عصر حاضر میں بھی عورت سے متعلق اِن نظریات کو اختیار کرتے ہوئے معاشرے کو سنوار سکتے ہیں''۔ (1)

یہاں ایک بات کی نشان دہی اہم ہے کہ شاہ نے اس سب کچھ کا راز یہ بتایا کہ عورت عشق و محبت کی سب سے حسین علامت ہے، پیار اس کی سرشت میں شامل ہے۔ شاہ نے محبت کو پاک قرار دیا۔ بنا محبت زندگی ناپاکی ہے۔ مطلب یہ کہ راستہ intense محبت ہے، ہمہ گیر کمٹ منٹ ہے۔ وہ کسی عورت کا کسی مرد کے ساتھ زبردستی کا بندھن باندھنے کے خلاف تھا۔(2)

اس نے اس بات کو اہمیت نہ دی کہ اصل قصہ میں پنہوں بھی عذابوں کے بھی عذاب جھیلتا رہا۔ وہ اولیت سماجی طور پر غلط العام تصور یعنی ''کنجشک''، ''ناتواں'' ''ضعیفہ'' کو دیتا ہے۔ وہ عمر بادشاہ کے سامنے اپنی آزادی کے لیے جس مضبوط ارادے کے ساتھ مارئی کو قائم و دائم دکھاتا ہے، وہ عورت کے لیے احترام و توقیر کو دوچند کر دیتا ہے۔ شاہ عورت ذات کی قدر آج نہیں بلکہ ایک ایسے عہد میں کرتا ہے جب عورتوں کا مقدر ہی مجبوری اور محکومی تھا۔ اُس کا پورا فلسفہ عورت کی عظمت و اہمیت کا آئینہ دار ہے۔ اُس نے عورت کو متحرک اور فعال کرداروں کی صورت میں پیش کیا۔ شاہ نے انسانی نجات کی جدوجہد میں عورت کو ایکٹو پارٹنر بنایا۔

لطیف اپنی کسی بھی ہیروئن کے ظاہری حسن پہ قصیدے نہیں پڑھتا۔ وہ تو حسن کے بجائے جذب دِل کے زور سے ہوت کو حب سے کھینچ لاتا ہے۔ اور یہ شاہ کا مسلسل رویہ ہوتا ہے اپنی ہیروئنوں کو بیان کرنے کا۔ آپ کو یاد ہوگا سُر لیلاں چنیسر میں شاہ اپنے اس نکتے کو مزید وضاحت سے پیش کرتا ہے:

جب سے میں نے کانوں میں سونے کی بالیاں پہنی ہیں،
گلے میں خوب صورت ہار ڈالا ہے
بانہوں میں کنگن پہنے ہیں اور خوشبودار تیل لگا کر بال سنوارے ہیں
تب سے میرے محبوب نے مجھے پوچھنا چھوڑ دیا ہے
(دل کرتا ہے اِن چار مصرعوں کو ہر چوک پر جلی سرخیوں میں لکھا جائے)۔

شاہ نے عورت کو وطن دوستی، طلب، جہدِ حصولِ طلب، ارتقا و تسلسل اور وفا کا نمونہ بنا ڈالا۔

اسی طرح سُر ماروی پڑھیے تو آپ کو وہاں وطن، اور وطن دوستی ہی نظر آئے گی۔ صحرا نشیں، مغوی ماروی اپنے اغوا کنندہ بادشاہ عمر کے ریشم و جواہرات اور محلات پہ اپنے غریب وطن کی کٹیا کو ترجیح دیتی ہے۔ وہ رنگین ریشمی لباس، اعلیٰ نیلے قماش اور رنگین ملبوسات، کو بھاڑ میں پھینکتی ہے۔ اُسے تو اپنے وطن میں چیتھڑہ اور کھدر پوشی عزیز ہے۔ وطن (ملیر) جہاں لوگ بارش کا میٹھا پانی پیتے ہیں اور درختوں کے سایہ میں رہتے ہیں۔ جونڈرا اور بے جھجک ہیں۔ اُسے اپنے گاؤں کے جنگلی پھول پودے یاد آتے ہیں۔ اس کی سانسیں اپنے جھونپڑے میں اٹکی نظر آتی ہیں۔ وہ بادشاہی قلعے کو اپنی آنہوں سے مٹی کا ڈھیر بنانا چاہتی ہے تاکہ آزاد ہو کر اپنے ملیر پہنچ جائے۔ ملیر، جو اُن غریبوں کا اوڑھنا بچھونا ہے، اُن کے عیب ڈھانپتا ہے۔ وہ بادشاہ سے استدعا کرتی ہے کہ ''اگر وہ وطن کے لیے ترستی ہوئی وہاں مر جائے تو اس کی قبر اُس کے اپنوں کے ساتھ بنائی جائے، پھر اس قبر پر اس کے دیس کی جڑی بوٹیوں کی دھونی دی جائے'' اس لیے کہ اگر ''میری میت ملیر میں دفن ہوئی تو میں مر کر بھی زندہ ہو جاؤں گی''۔ اس داستان میں شاہ نے ایک شاہ کے سامنے ایک نہتی وطن پرست لڑکی کو بہادری اور استقامت کے ساتھ مزاحمت کرتے دکھایا۔

شاہ کی سسی کے بیان میں کھیت ہیں، چراگاہیں ہیں، پہاڑ ہیں، فیوڈل کی چمکتی زندگی کے ساتھ ساتھ مچھیروں ملاحوں، جوگیوں کے جھلسے بدن اور سخت ہتھیلیاں ہیں۔ کون کہتا ہے کہ بلوچی اور سندھی زبانوں میں انسان اور انسانی زندگی کے علاوہ بھی کچھ ہے؟۔ ہم خواہ مخواہ اپنی اِن قدیم زبانوں میں رجعت پسندی ڈھونڈتے رہتے ہیں۔

اور اُس کے لیے ہم شاہ لطیف اور اُس کے ہم فکر شعرا کے احسان مند رہیں گے۔ سیاستیں، ریاستیں، راجے اور راجوڑے رہیں نہ رہیں بھٹائی رہے گا، اُس کی شاعری رہے گی۔ جو مفکر انسان کو بہتر سے بہتر بنانے کی کوشش کرتا رہے وہ تو آفاقیت کا شہری ہوتا ہے۔ آفاقیت کو مقامیت تک محصور کیے رکھنے سے بڑا گھناؤنا جرم کیا ہوگا؟۔ بھلا شاہ لطیف جیسے انسان کو کسی جغرافیائی حدود میں بند رکھا جا سکتا ہے؟۔

ہم نے دیکھا کہ زندگی کا ہر نشیب ہر فراز، ہر رخ، اور ہر رنگ لطیف سائیں پر بیت چکا۔

جفاکشوں کی جیون کتھا' اُن کی امنگیں، اُن کی مشکلات اور اُن کے لیے آسانیوں کی تلاش' عورت کی ابتر حالت اور زبردست جفاکشی.....

دوہرا کر آگے بڑھیے کہ کسی بھی داستان کو اٹھا کر دیکھیں، شاہ کے افکار کی ہیروئن کوئی ملکہ نہیں ہے۔ اس کے مرد ہیرو ہمیشہ اشرافیہ سے ہوتے ہیں اور ہیروئن عام عورت ہوتی ہے بلکہ اکثر تو نچلے طبقے کی یا سماجی طور پر دوسرے درجے کی شہری ہوتی ہے۔: پنہوں بلوچ سردار ہے جبکہ سسی دھوبی کی (لے پالک) بیٹی ہے۔ پنہوں عطر کا عادی ہے جب کہ سسی صابن سے اٹی ہوئی۔ رانڑو راجپوت ہے، جنگجو طبقے کا رکن جو کہ ''بیسوا'' مومل کی کشش میں ہے، تماچی سندھ کا حاکم ہے اور اس کی محبوبہ نوری مچھیرن ہے۔ حتیٰ کہ میہار کی محبوبہ کمہار کی بیٹی سوہنڑیں ہے۔(3)

پھر یہ بھی دیکھیے کہ نہ ہی اُس کا ہیرو کوئی ایسا مرد ہے جو تیشہ ہاتھ میں لیے پہاڑ کھود کر دودھ کی نہریں لا رہا ہو۔ نہ وہ مرد کو سمندر پھلانگوا تا ہے، نہ اُس سے شیر مرواتا ہے اور نہ اُس کے ہاتھوں مافوق الفطرت قوتوں کا استعمال دکھا دکھا کر عورت کو غیر فعال محبوبہ بنا کر اُس کے باپ سے چھنواتا ہے۔ شاہ نے اِس کے برعکس ہیرو کو خاموشی کی چادر اوڑھا دی۔ اور ہیروئن کو گویائی دی، اُسے رلایا، چیخوایا لڑوایا۔

مگر ایک بات کا خیال رہے؛ شاہ اپنی ہیروئن کو معتبر اور محترم تو بنا لیتا ہے لیکن اُسے کوئی مافوق الفطرت ہستی نہیں بناتا۔ اس کی ہیروئن تو مکمل طور پر زمینی انسان تھی، زمین پہ رہی عام زمینی انسانوں کے بیچ۔ اس کے آدرش، انسانی آدرش ہیں، عام انسانی عزائم اور انسانی جدوجہد۔ وہ ایک زندہ کردار تھی، سماج میں متحرک کردار۔

اِس بہت بڑے فن کار نے اپنی شاعری میں نئے کردار تخلیق نہیں کیے، بلکہ اس نے پہلے سے موجود کلاسیک کے کیریکٹرز کو ہی لیا اور انہیں جدت سے برتا۔ اس نے انسانی جذبات کی سچائی اور حقیقت، نیز انسانی سماج کی بھلائی کے لیے اعلیٰ اقدار کی ضرورت کو اپنی دھرتی اور اپنے لوگوں کے حوالے سے بیان کیا۔ یہیں عورت پر اس کا احسان سامنے آتا ہے۔ وہ اسی کلاسیکل ادب میں موجود عورت کے بارے میں مردانہ سماج والے مروج رویے کو اکھاڑ پھینکتا ہے۔ وہ اسی کمزور، بے عقل، اور

مفلوج عورت کو بغاوت جدوجہد بیداری، بے خوفی مستقل مزاجی اور وفاداری کا پیکر ثابت کرتا ہے۔ سچ ہے کہ شاہ لطیف عورتوں کا، عورتوں کی جدوجہد کا اور عورتوں کی تحریک کا شاعر ہے۔(4)

اور اِس سارے باب کے نچوڑ میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ سسی ''رسالو'' میں سب سے بڑا ڈرامائی کردار ہے۔ اس داستان میں شاہ اپنی تعلیمات کی چوٹی تک پہنچتا ہے۔ اُس کے سارے فلسفے اور نظریے کا abstract بھی یہی داستان ہے اور Conclusion بھی۔

اُس کی سسی محکوموں اور ان کی جدوجہد کی علامت ہے، پنہوں ایک بہادر اور مصمم قومی راہنما ہے جسے سرداروں نے قیدی بنا رکھا ہے، کیچ انقلاب و آزادی کا دیس ہے اور پنہوں کے بھائی وہ فاشسٹ قوتیں ہیں جو انقلاب کو رسیوں سے باندھ کر عوام الناس کی ترقی اور خوش حالی کا راستہ روکتے ہیں، پنہوں کے نقش پا مٹا دینے والی ہوا، راستہ اندھیر کرنے والا ڈوبتا سورج، دیر سے طلوع ہوتا چاند' جنگل اور پہاڑ راہِ انقلاب کی مشکلات ہیں۔ تکالیف اور دکھ اس جدوجہد کے راہنما ہیں۔(5)

شاہ لطیف نے سسی پنہوں کی داستان کو ایک شخصی واردات سے بہت بلند کر کے اُسے شاہ عنایت شہید کی انقلابی جدوجہد کا رپورتاژ بنا ڈالا۔ یہ اب محض ایک داستان نہیں ہے، یہ تو ایک انقلابی کا مینوئل ہے، ایک ریڈ بک ہے، ایک بلیو بک ہے، ایک ہینڈ بک ہے اور ان سب سے بڑھ کر ایک مینی فیسٹو ہے۔

حوالہ جات

1- نقوی، نعیم۔ طاہر تونسوی کی کتاب ''آئینہ خانہ شاہ لطیف''۔ 2010۔ محکمہ ثقافت حکومت سندھ۔ صفحہ 103

2- فہمیدہ حسین.....شاہ لطیف کی شاعری میں.....بھٹ شاہ۔ صفحہ 249۔

3- شمل، این میریں 2003- Pain and Grace۔ سنگ میل پبلکیشنز۔ لاہور صفحہ 174

4- فہمیدہ حسین.....شاہ لطیف کی شاعری میں.....صفحہ 485

5- سید، جی۔ ایم۔ Shah Latif and his message

بارش.....ایک سماجی تبدیلی

مست توکلی اور شاہ لطیف میں ایک بات حیرت انگیز طور پر مشترک ہے؛ یہ دونوں بارشوں کے دیوانے ہیں۔عوامی خوش حالی اور عمومی خیر اِن دونوں فلاسفروں کی شناخت ہیں۔اُن کی شاعری، گفتار اور دعاؤں میں ہمہ وقت انہی دو باتوں کا تذکرہ رہتا ہے.....اور بارش ہر طرح سے عوامی خوش حالی لاتی ہے اور بھوک سے نجات دلاتی ہے۔قحط و وبائیں ہمیشہ شاہ کے سامنے بڑی بلائیں رہیں۔اُن دونوں کی شاعری پڑھیں تو اندازہ ہوگا کہ بارشیں مستؔ ولطیفؔ کو کبھی کبھی اپنی محبوباؤں سے بھی زیادہ محبوب رہیں۔

وہ اپنی شاعری میں جابجا اپنے وطن کی سبزی سرسبزی کی دعائیں گڑگڑاتا ہے۔

بادلوں کی مختلف انواع اِن کا شوقین ترین موضوع رہے ہیں۔گرج کی ایک ایک قسم، چمک کی ایک ایک ادا، بارش کی بے شمار قسمیں، اِن دو آدمیوں نے آسمان اور بادلوں کا گویا مکمل پٹوار کر رکھا ہو۔

بارش و ابر انہیں مکمل طور پر اپنے ٹرانس میں لے لیتے ہیں۔بارش ہو تو پھر یہ اپنے جذبات قابو نہیں کر سکتے، بچوں کی طرح مچل مچل جاتے ہیں۔جیسے مٹکوں شراب پی رکھی ہو۔ بادِ باراں کے ایک ایک جھونکے پر جھوم جھوم جاتے ہیں۔انہیں اُس خوش حالی کا اندازہ ہے جو بارشیں عوام الناس کے لیے لاتی ہیں۔گھاس چارہ مویشی کے لیے، تازہ میٹھا پانی پینے کے لیے، فصلیں اناج اگلنے کے لیے.....

سماج شانت ہو جاتا ہے۔ساہوکار کے قرض سے نجات ہو جاتی ہے، قحط کی بھیک منگی سے آزادی مل جاتی ہے۔معاشی سکوت و جمود چھنا کے کے ساتھ ٹوٹ جاتا ہے۔معاشی حرکت و سرگرمی سیاسی سکوت کو کچکو کے مار کر جگا دیتی ہے۔عوام الناس کو محنت کی گنجائش ملتی ہے۔اور محنت خود اعتمادی بخشتی ہے۔ بے پناہ خود اعتمادی۔انسان پھر سے انسان بن جاتا ہے۔محنت ہی انسان کو اشرف المخلوقات بناتی ہے۔

شاہ لطیف چرواہوں، گوالوں، اور کسانوں کا طرفدار شاعر ہے۔وہ مہنگائی، چور بازاری اور زخیرہ اندوزی کا مخالف دانشور ہے۔اس لیے کہ اس سے خلقِ خدا کی زندگی اجیرن ہو جاتی ہے۔ شاہ تو بارش برسات دودھ، دہی، مکھن چراگاہ اور خوشحالی کا دعا گو ہے۔وہ بخیل، سیٹھ، سرمایہ دار کو بدعا دینے والا ولی ہے:

حکم ہوا بادل کو سارنگ کے استقبال کی تیاریاں کرنے کو
بجلیاں چمکتی ہیں پانی برستا ہے اور جم کے بارش ہوتی ہے
جنہوں نے مہنگا بیچنے کے لیے جمع کیا تھا وہ ہاتھ ملتے ہیں
پانچ سے پندرہ ہونے کی بات انہوں نے بہی کھاتوں میں لکھ رکھی تھی
شالا تمام دیسوں کے ایسے موذی سب مر جائیں
اور میرے غریب گوالے اور کسان خوشی سے بادل برسنے کی باتیں کریں
اے خدا سب کو تیرا ہی آسرا ہے اور تجھ ہی میں امید ہے

شاہ زندگی کا ساتھی ہے۔زندگی کی بقا اور دوام چاہتا ہے۔اس نے زندگانی کی ضمانت اور آزادی و آبادی کے سب سے بڑے اور اہم ترین عنصر یعنی بارش کا تذکرہ بہت بار اور بہت پیار سے کیا ہے۔

سُر ''سارنگ'' جسے مون سون میں گایا جاتا ہے، ہمیں مستیں توکلی کی یاد دلاتا ہے۔کسی محقق کو بارشوں کی طلب کے بارے میں اِن دونوں بڑے فلاسفروں کے کلام کے اندر موجود مماثلت پہ تحقیق کرنی ہوگی۔طرز ایک جیسا، اشتیاق ایک جیسا، خیر مقدم ایک جیسا، موسیقیت ایک

سی.....بس چار مصرعے نمونے کے طور پر:

''سارنگ (ملہار) کو تمام مخلوق یاد کرتی ہے جن میں زمین پر بسنے والے تمام چرند، پرند، انسان حیوان شامل ہیں۔ دوسری طرف آسمان میں اڑنے والے پپیہے برکھارت کے انتظار میں پیہو پیہو بول رہے ہیں اور سمندر کی تہہ میں رہنے والی سیپ بھی روزانہ بارش کے اس قطرے کا انتظار کرتی ہے۔ اے میرے محبوب سارنگ، میرے غریب کسانوں پر مہربانی کر اور اتنا برس کہ ہر طرف خوشی اور سکھ پھیل جائے۔'' (ترجمہ: فہمیدہ حسین)

آیئے اِس خیر خواہی اور شریف دلی کا ایک اور مظاہرہ دیکھیں:

''اپنی دھرتی پر اپنا گھر آباد ہو، آنگن میں اعلیٰ نسل کا گھوڑا بندھا ہو، باہر خوبصورت کُنڈھی سینگوں والی بھینسیں کھڑی ہوں، خوشبو سے مہکتی سیج پر ساجن کا ہمیشہ ساتھ ہو اور برسات کی رم جھم جاری ہو۔ ایسے میں دعا کرتی ہوں کہ دن ہمیشہ ایسے ہی رہیں اور میرے محبوب کا ساتھ ہمیشہ سلامت رہے''۔

اللہ شاہ کی دعا قبول کر۔ آسمان خیر کی بجلیوں بادلوں اور برسات سے آباد رہے!، لوگ شاد و آباد ہوں، ہر جگہ سبزہ اور بہار ہو ، پانی کی فراوانی ہو، غلہ موجود ہو، جانور اور چارہ اور پانی فراواں ہو، دودھ اور مکھن بسیار ہو.....سب کے لیے۔

بارش تو محتاجی سے نجات ہے۔ محتاجی تو حیوانیت ہے۔ خفتہ دیہات میں تبدیلی کی رفتار سکوت کے برابر ہوتی ہے۔ لے دے کے خوشگوار ارتعاش بارشوں سے پیدا ہوتی ہے۔ اور عوام الناس کی اکثریت یعنی کسان انفرادی سطح سے لے کر خانگی اور سماجی حد تک سبک رفتاری میں آجاتے ہیں۔ زندگی حرکت میں آجاتی ہے۔ حرکت میں برکت اور سکون میں موت ہے۔

''اے سارنگ، تجھے واسطہ اللہ کا میرے اِن بھوکے پیاسے لوگوں کی خبر گیری کرنا اور خوب مینہ برسانا، تاکہ اناج ارزاں ہو جائے اور پانی کی قلت نہ ہو۔ تجھ سے التجا ہے کہ میرے وطن کو آباد اور خوشحال کر دے تاکہ ان محنت کش غریب کسانوں کو خوشی اور سکھ حاصل ہو''۔

.....اور پھر ساون آ ہی گیا:

ساون کی رت آئی
قہقہے اور چہچہے بلند ہوتے ہیں
کوئل کی تیکھی تیکھی کوک فضا کو چیرتی ہے
ہاریوں نے ہل جوت دیے ہیں
گڈریے خوش ہیں
برکھا کی رت آ گئی
خوشی کے چہچہے اور میٹھے میٹھے زمزمے بلند ہوئے
بادلوں کے دل کے دل نمودار ہوئے
اناج سستا ہو گیا
مٹکے مکھن سے بھرپور ہو گئے

جی ایم سید کے خیال میں شاہ کا ''سارنگ'' دراصل انقلاب ہے۔ شاہ نے انقلاب کی خواہش کی اور انقلاب دشمنوں کو کوسا۔ اور انقلاب دشمن تو ہر دور میں ذخیرہ اندوز، منافع خور، سودی اور جاگیردار رہے ہیں۔ شاہ لطیف اُن کی تباہی و بربادی کی دعائیں کرتا ہے، انہیں کوستا ہے۔ لطیف نے ہر وقت عوام کی مشکلات، دکھ اور محرومی دیکھی، اُسے محسوس کیا، انہیں متحد و منظّم ہونے کی حمایت کی اور اُن کے لیے سانجھی مسرور زندگی کی دعا کی۔ شاہ لطیف کا شمار اُن انسان دوست دانش وروں میں ہوتا ہے جنہوں نے کسان اور خانہ بدوش سے ہر دم اپنی رفاقت و ہمدردی دکھائی۔ اسی طرح نیم فاقہ کش مچھیرے اور کمہار اُس کی نیک خواہشات کا مرکز تھے۔ شاہ نے کسی بادشاہ، پیر اور جاگیردار کی تعریف نہ کی۔ وہ تو مچھیروں کی تعریفیں کرتا ہے اس کے باوجود کہ وہ میلے گندے اور پھٹے پرانے چیتھڑوں میں ملبوس ہیں اور اُن کی کالی بدصورت عورتوں کی تعریف کی ہے جو بدبودار مچھلی کی ٹوکریاں سر پہ اٹھائے چلتی ہیں۔ اس نے چرواہوں گڈریوں کی باتیں کی۔ اس نے بزگروں ہاریوں کی مصائب بھری زندگی کو بیان کیا۔

ہم بارشوں (انقلاب) کو صدائیں دینے والے کو بیان کررہے ہیں۔ انسان کو بیان کرتے رہنے والا خود بیان وتذکرے سے کبھی محروم نہیں رہتا۔ شاہ کا بیان، شاہ کا تذکرہ اور شاہ کی توصیف کیے بغیر کوئی کیسے انقلابی کہلائے گا!!

حوالہ جات

1- تناصرو، منظور احمد۔ شاہ عبداللطیف بھٹائی، حیات وافکار۔ 2009۔ سندھیکا۔ صفحہ 204

بلوچ، شاہ کا محورِ امید

میں جب کبھی بلوچ کو خدا کی ناشکرئی کرتے سنتا یا پڑھتا ہوں تو تڑپ کررہ جاتا ہوں۔ اتنی نعمتوں (اور فراواں نعمتوں) کے باوجود کوئی شکوہ کرے تو اِس کا کوئی جواز تو نہیں بنتاناں!۔ خدا کی عطا کردہ نعمتوں میں گنج وگوہر سے بھراوسیع رقبہ، اپنے اپنے لوازمات سے لیس سارے موسم، اہمیت کے لحاظ سے دنیا کا اہم ترین سمندر، اس کی اپنی جغرافیائی location، مذاہب جنم دینے والا کلاسیک، مقدس مقامات.....کن کن نعمتوں کا تذکرہ کیا جائے۔ ایک ایک عنوان پر بیسیوں کتابیں لکھی جاچکی ہیں۔

مگر ہم، دانش ور لطیفؔ کے بہت شکر گزار ہیں کہ اس نے ہماری توجہ ایک اور نعمت کی طرف مبذول کرائی: بلوچ بطور آئیڈیل انسان۔ گوکہ اس بارے میں انگریز نے بھی کچھ کچھ تذکرہ کیا تھا، پرتگیزیوں نے بھی، اور فردوسی نے بھی۔ مگر بطور، مہذب وشائستہ انسان بلوچ کا نسبتاً جامع اور مربوط ومنظّم تذکرہ صرف شاہ لطیف کا حصہ تھا۔

شاہ لطیف کے ''رسالو'' کو دیکھتا ہوں تو اندازہ ہوتا ہے کہ ہم بلوچوں کو متاثر کرنے والے اِس شاعر کی شاعری میں بلوچی شاعری کا بہت اثر پایا جاتا ہے۔

مگر، ایک بات واضح ہے کہ وہ زمانہ نعرے بازی کا نہ تھا اور چوں کہ سرمایہ داری نہ تھی اس لیے نیشنل شاؤنزم وغیرہ بھی نہ تھا۔ میں نے بہت باریکی سے دیکھا۔ شاہ نے کہیں بھی، اور کبھی بھی بلوچ کا ذکر محض جذبات کی وجہ سے نہ کیا۔ اُس نے سب کچھ عملی طور پر دیکھ کر، پرکھ کر، آزما کر

اور تسلی کر کے کہا۔

دیکھیے ناں، وہ تو سفر کرنے والا سیلانی تھا۔ بلوچستان کے دورے کرنے والا۔ وہ سندھ میں اُن علاقوں میں گھومتا پھرتا رہا جہاں بلوچ آباد تھے۔ اس کے علاوہ یہ بھی تو ہوگا کہ اتنے بڑے مرکز بھٹ شاہ میں بلوچ شاعر، بلوچ گویے اور موسیقار آتے رہتے تھے، جو بلوچی ادب وشاعری سے شاہ کو محظوظ کرتے تھے۔

یہی وجہ ہے کہ اگر آپ کو بلوچی شاعری کی سادگی دیکھنی ہو تو شاہ کی سندھی شاعری میں دیکھیے۔ بلوچی شاعری میں جو خلوص موجود ہے وہ شاہ کی سندھی شاعری میں موجود ہے۔ تخیل کی کم رنگ آمیزی اگر بلوچی شاعری کی صفت ہے، تو یہی اعلیٰ صفت شاہ کی شاعری میں بھی موجود ہے۔ بلوچی شاعری میں ابر و بارش اور رعد و برق کو جس تفصیل سے بیان کیا گیا ہے شاہ کی شاعری میں یہی طرز موجود ہے۔(1)

اب آیئے موضوع کی طرف۔ اور یہ بات پہلے ہی واضح ہو کہ شاہ لطیف نے بلوچوں میں صرف مثبت اور تعریفی پہلو ہی نہیں دیکھے (زیادہ تر سسی کی ہی زبانی) بلکہ بلوچ میں جو منفی خصوصیات ہیں، وہ بھی بیان کی ہیں۔

ممکن ہے بلوچوں میں اُس وقت سرداریت اس قدر بھیانک صورت میں موجود نہ تھی، یا شاہ کو زیادہ معلومات نہ تھیں۔ مگر سچی بات یہ ہے کہ دونوں باتیں درست نہیں ہیں۔ ارے بھئی شاہ نے کبھی مقتدرہ کو موضوع بنایا ہی نہیں۔ یہ بات درست ہے کہ پیداواری قوتوں کی ترقی کے سبب جب پیداواری رشتے بدل جاتے ہیں تو خود پیداواری قوتیں (اس تبدیلی کے خالق ہوتے ہوئے بھی) بھی بدل جاتی ہیں۔ مگر یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ پیداواری قوتیں ہمیشہ اپنے سماج کا اعلیٰ ترین اور جامع ترین لوگ ہوتے ہیں۔.....اور انہی لوگوں کا تذکرہ شاہ نے کیا۔ اور کیا خوبصورت انداز میں کیا!۔ جی ایم سید کے الفاظ میں: ''شاہ لطیف کی شاعری کے سارے عمدہ سُر تال بلوچوں کی کہانیوں اور کرداروں کی تعریف سے لبریز ہیں''۔(2)

جی ایم سید کے خیال میں ''شاہ نے بلوچ کی جرأت، ارادے کی پختگی، اپنے عزم کے

ساتھ وابستگی اور لیڈر شپ کی صفات کا باریکی سے مشاہدہ کیا۔ وہ کلہوڑا فاشسٹ اور متکبر حکومت اور ان کی مفاقتانہ پالیسیوں سے تنگ آ چکا تھا۔ چنانچہ شاہ نے بلوچوں کے ذریعے سندھ میں ایک تبدیلی کی نشانیاں دیکھنی شروع کیں اور اس نے اُن میں خود اعتمادی پیدا کرنے اور ان کی حوصلہ افزائی کرنے کا فیصلہ کیا۔

اور وہ جو ہم لیوشاؤچی کی کتاب ''How to be a Good Communist'' پڑھا کرتے تھے اور اس سے انسپائر ہوتے تھے۔ وہ زمانہ ہماری زندگیوں کے لیے کتنا اچھا زمانہ تھا۔ مگر ہماری زندگیوں کا اُس زمانے میں عیب یہ تھا کہ وہاں ہم شاہ کو نہیں پڑھتے تھے۔ ہم اپنے اِس لیوشاؤچی کو نہیں پڑھتے تھے جو ہمیں اپنی زبان میں اپنے علاقے کے مطابق اچھا انسان بنا سکتا تھا۔

ذرا شاہ کو تو دیکھیے:

اٹھو اور اپنے رب سے وعدہ کرو، جھوٹ اور باطل کمائی مت کرو
اپنے دل کو دغا سے پاک رکھو کیوں کہ سائیں کو حق اور سچ پسند ہے
اپنے من میں محبت کا شعلہ بلند کر کے اس کی روشنی میں عمل کرو گے
تو یہ سودا تمہارے لیے فائدہ مند ہوگا!

کیسا؟۔ لیوشاؤچی کی خوشبو آئی ناں اِس کلام میں!۔ مگر یاد رکھیے کہ یہ کلام لیوشاؤچی سے ساڑھے تین سو سال پہلے کا ہے۔ مزید دیکھنا ہے؟۔ آیئے دیکھتے ہیں کہ ہمارا حکیم دانا اور یہ استاد، انا، غرور اور تکبر سے گردن اکڑا کر چلنے والیوں کے برعکس عجز کو کس طرح ترجیح دیتا ہے:

بھاڑ میں جائیں اونچی ذات کی سمہ سومرا رانیاں جو گردن تان کر آتی ہیں
اُن سے بہتر ہیں کینجھر جھیل کی مچھیرنیاں،
جن کو تماچی (محبوب) کی طلب اور تڑپ ہے
ان رانیوں کے ہوتے ہوئے مچھیرن کو انمول محبوب حاصل ہوا

آپ نے آمین کہا؟ رانی بھاڑ میں جائے مچھیرنی بہترین ہے۔ یہ ہے ہمارا مردم شناس شاہ، ہمارا مردم ساز شاہ۔ یوٹوپیائی عہد کا لیوشاؤچی!!۔

قارئین! میں بلوچ ہوں، فطری طور پر، شاہ کی ضخیم کتابِ دانش میں سب سے پہلے جس حصہ کے چننے پر مامور ہوں، وہ ہے سسی پنہوں کا حصہ۔ میں تو بلوچ ہونے کی وجہ سے ایسا کرتا ہوں مگر باقی دنیا تو علم ودانش میں غنی ہونے کی خاطر اُسے منتخب کرتی ہے۔ شاہ کا سارا کلام سر آنکھوں پر، مگر میں بوجوہ سسی پنہوں کے حصے میں خود کو اپنے ہی گھر میں محسوس کرتا ہوں۔ ہر بلوچ ایسا ہی محسوس کرتا ہے۔ ایسی نسبت جو مجھے پیدائشی نصیب ہوئی ہے۔ میں برادرانِ پنہوں کا کفارہ ادا نہیں کررہا کیوں کہ عشق کا کفارہ ہوتا ہی نہیں۔ ''خون بہا'' کا لفظ تو ہم نے سن رکھا ہے، ''شیر بہا'' بھی سن رکھا ہے مگر ''عشق بہا'' کبھی نہ سنا..... اور اگر عشق کا کفارہ ہوتا بھی ہو تو عشاق ہی عشاق سے ایسا لین دین کرنے کے مقام پہ فائز ہو سکتے ہیں ہم جیسے دنیاوی لوگ اس کے مجاز نہیں۔

سسی پنوں، بلاشبہ ایک ایسی داستانِ جہد ہے جو تمام ادوار کے سارے انسانوں کو مسرور ومتاثر کرتی رہی ہے۔ شاہ لطیف نے اپنی تمام تر صلاحیتوں کو مجتمع کر کے اور انہیں باہم گوندھ کر سسی پنوں کی داستان کو سنوارا۔ اُس نے اپنی ساری قابلیت، اپنا سارا علم ومشاہدہ اور وقت کا بہت بڑا حصہ اس دستان میں ڈال دیا۔ اور اس کی شاعری کا بھی بڑا حصہ سسی پنوں کی کہانی پر وقف ہے۔ اگر سسی اُس کے کلام سے نکال دی جائے تو شاہ کے سیندک کے سونے کے ذخائر میں تو کچھ کمی نہ آئے گی، سندھ کی سندھڑی گیری میں شاید کوئی مکھی نہ گرے گی، مگر بلوچ سے حسرت و یاس کے ساتھ کوئی لطیف اصرار نہیں کرے گا کہ:

مُھنجووَس واکا، بُدھنڑ کم بروچ جو

میں بلوچ افق پر اس لیے بھی رہنا چاہتا ہوں کہ وہاں سے تفہیمِ لطیف میں مجھے بہت آسانی ہوتی ہے۔ میں ہر بلوچ سے کہتا ہوں کہ شاہ کے فلسفے کے مرکزے تک رسائی کے لیے سسی پنہوں کی داستان سے ہی گزرا جائے۔ سسی پنہوں کی داستان ایک ایسی ٹریجڈی ہے جسے محض ایک کہانی کے بطور نہیں دیکھنا چاہیے۔ ارے بھئی اُسے تو شاہ نے اپنے خیالات کا میڈیم بنا ڈالا۔

شاہ نے سسی پنوں کی کہانی کے تحت سندھ اور بلوچستان کے علاقوں کی سماجی زندگی کے بہت سے پہلو نمایاں کیے ہیں۔ وہ تیز رفتار اونٹوں، اور ان کی منزلوں کی بابت باخبر کرتا ہے۔ وہ

ہمارے اونٹوں کی سجاوٹ، اور ساربانوں کی وضع قطع کو بیان کرتا ہے۔ وہ مشک وعنبر اور دوسرے تجارتی سامان کی ترسیل کرنے والے بلوچوں کی زندگی کے ہر پہلو کو سامنے لاتا ہے.....اور شاہ نے ان سفرناموں کی مشکلات سسی کے شیریں دھن سے ہمیں سنائی ہیں۔

لطیف کی کتابِ دانش بہت لطیف مگر بہت ضخیم ہے۔ اور یہ ضخیم کتاب تین سو سالوں سے سب سے بڑی کتاب یعنی انسانوں کے دلوں میں سینہ در سینہ لکھی جاتی آ رہی ہے۔ 'شاہ جو رسالو' کے پورے پانچ سُر صرف داستانِ سسی پنہوں کے لیے مخصوص ہیں: سُر سسی آبری، سُر معذوری، سُر دیسی، سُر کوہیاری، اور سُر حسینی۔ ان پانچوں سُروں میں پنہوں ہے، کیچ ہے، بلوچ ہے اور محبت ہے۔ شاہ کی کل شاعری تقریباً 480 صفحات پر مشتمل ہے۔ اور اِن 480 صفحوں میں سے سسی کے لیے مخصوص پورے پانچ سُروں کی ضخامت 120 صفحوں کی بنتی ہے۔ 120 صفحوں کے علاوہ سری راگ (Sri Rag) کے 20 اور سُر رپ کے 9 صفحوں میں بھی جزوی طور پر سسی پنہوں کا تذکرہ ہے۔ پھر سُر کلیان کی اُس وائی میں بھی سسی ہی کا ذکر موجود ہے جس میں اس کے محبوب کو ہوت لے جا رہے ہوتے ہیں۔ اس طرح شاہ کے کلام کا بڑا حصہ سسی کا، پنہوں کا، وندر کا، لسبیلہ کا، حب کا، پب کا، کیچ کا، ہنگلاج کا، لاہوت کا، گورکھ ناتھ کا، کوہیار کا، ونکار کا، گوندر کا، کلات کا، کوہستان کا' بلوچستان کا بنتا ہے۔.....بلوچ کو تو ناز کرنا چاہیے، خود پہ، اپنی قوم پہ، اور اپنے اِس قومی شاعر پہ!!

زمان کے ہر گلوبینگ کی مطابقت میں جغرافیائی سرحدیں انگڑائیاں لیتی رہتی ہیں۔ اور سرحدوں کی انگڑائی سیکڑوں میلوں کی ہوتی ہے۔ لہٰذا تین سو سال قبل سندھ کیا تھا، اُسے کیا ہونا چاہیے تھا، یا بلوچستان کیا تھا اسے کیا ہونا چاہیے تھا، کوئی معانی نہیں رکھتے۔ بڑے مفکر ویسے ہی جغرافیائی سرحدوں کے دیمک ہوتے ہیں۔

لگتا ہے ہم سب نے اُس اچھے فقرے پر نعرے بازی کی کالک پھیر دی جس میں ہم آپ کہا کرتے تھے کہ ''تاریخ حکمران نہیں، عوام بناتے ہیں''۔ اب تو ہم کلہوڑوں کی حکمرانی پر اتراتے ہیں، نصیر خان کی فیوڈل خانی پہ فخر کرتے ہیں۔ فیوڈل حکمرانی کیا اور اس پر افتخار کیا؟

اس لیے فیوڈل حکمرانوں اور ان کی سرحدوں کو ایک طرف رکھیے اور اس حقیقت پر غور

کیجیے کہ بلوچی بولنے والے اور سندھی بولنے والے عوام الناس موجود تھے اور زندگانی کے جشن و ماتم باہمی مدد و تعاون سے جھیلتے تھے۔ اور شاہ لطیف اس غم و خوشی کے اشتراک کا شاعر تھا۔

شاہ لطیف کے مجموعہِ کلام کی ایک ایک سطر پورے علاقے کے روحانی ذہن کے خدوخال کو واضح کرتی ہے۔ اس نے تو شاعری میں سفرنامے لکھے۔

شاہ لطیف کی فن کاری کی عظمت کا ایک اور رُخ دیکھیے۔ وہ اپنی سسی کو پنہوں کے خلاف کسی قسم کی شکایت، تلخی، یا طعنہ بازی کرنے نہیں دیتا۔ شاہ کو بلوچوں سے اتنا پیار ہے کہ اس کا یہ پیار سسی کی محبت سے بھی بلند درجے پر جاتا ہے۔ شاہ لطیف کی شاعری کے عمدہ ترین حصے بلوچ کے قصوں اور کرداروں کی توصیف سے مرصع کیے ہوئے ہیں۔ شاہ کی سسی بلوچ کو صرف بلوچ نہیں پکارتی کہ اس واحد لفظ سے پیار کی بے انت پیاس بجھ نہیں پاتی۔ اس لیے پیار کبھی آرتی بن جاتا ہے، کبھی کیچی بن جاتا ہے، کبھی جتؔ اور کبھی آریچہؔ جیسے الفاظ میں ڈھل جاتا ہے۔ شاہ لطیف بلوچ کی ساری اچھی خصلتوں کو جمع کرتا ہے، اُن میں سے بھی اچھی اچھی خاصیتوں کو چھان کر الگ کرتا ہے اور پھر انہیں اپنی مکمل طرفداری کے شیریں آب سے گوندھتا ہے۔ شاہ ہمارے سامنے ایسے بلوچ کو پیش کرتا ہے جو مہناز، شہ مرید، بیورغ، گل بی بی، بالاچ، اور توکلی کا مجموعہ ہے۔ شاہ لطیف کا بلوچ بہادر ہے، اپنے قول پہ پکا، راہنمائی کے اوصاف سے مرصع۔ شاہ کا بلوچ ہر عہد کی فاشسٹ حکومت سے نبرد آزما رہتا ہے۔

شاہ کی سسی بلوچوں کے لئے سراپا ملائمت، حلیمی اور طرف داری کا نام ہے۔ وہ کیچیوں کی شان و شوکت کو ہفت آسمان تک بیان کرتی ہے اور خود کو اُن کی خاکِ پا گردانتی ہے۔ شاہ کی سسی تو خدا کے واسطے دے کر، کنیز بن کر رہنے کی قسمیں کھا کر، پنہوں سے لوٹ آنے کی درخواستیں کرتی ہے۔ شاہ کی سسی اعلان کرتی ہے کہ کیچ والے جیت گئے اور وہ ہار گئی مگر ہار میں بھی وہ اُن پہ واری ہونے کا پریس کانفرنس کرتی رہتی ہے۔ اتنے بڑے گہرے گھاؤ کے باوجود وہ شترستان کی جانب طنز کا، شکوہ کا کوئی تیر نہیں چلاتی۔ بلکہ اس کی بے زبانی جتوں کی نوجوانی کی سلامتی کی دعا کرتی جاتی ہے۔ خود پہ اسرافیلی صور پھونکے جانے کا جواز خود کو دھوبن اور محبوب کو اشراف خاندان ہونے میں بیان کرتی ہے

۔معمولی سی ڈھارس اور ذرا سی امید کو ترستی یہ دیوی آگے ہی بڑھتی رہتی ہے۔ وہ ہر مخاطب کو ''چُپ ہو جا'' کہہ کر ڈانٹتی ہے کہ وہ تو خاکسار ہے، پنہوں کے پیار کی ماری ہوئی ہے''۔ سسی بلوچوں میں نہیں خود میں کوئی ممکنہ خامی تلاش کرتی ہے جس کی بنا پر بلوچ اُسے دھتکار گئے تھے۔

.....پھر ایک اور بات بھی غور طلب ہے۔ گو کہ شاہ کو پڑھنے کے بعد یہ چھوٹی سی بات لگتی ہے مگر ہمارے نوجوان اس مخمصے سے باید ہے ہمارے ہاتھوں نکل جائیں۔ وہ بات ہے:

کیا شاہ لطیف سندھی ہے، یا وہ بلوچ ہے؟۔ ابھی بتاتا ہوں کہ اس سوال کی ضرورت کیوں پیش آئی:

میر گل خان نصیر نے شاہ کے کلام کے بہت تھوڑے حصے کو بلوچی منظوم ترجمے میں ڈھال دیا تھا۔ اپنی اُس کتاب میں میر صاحب نے شاہ کو کہیری قبیلے سے منسوب لکھا تھا۔ جو بلوچوں کا ایک روحانی (کرامتی) قبیلہ تصور ہوتا ہے۔ میں نے اپنے کسی مضمون میں میر گل خان کا وہ حوالہ نقل کیا تو ایک سندھی دانش ور نے زہر بھری مسکراہٹ مجھ پر ''نچھاور'' کر دی۔ گویا شاہ لطیف کو بلوچ نسل سے تصور کرنا بھی، پتھر مار مار کر مارنے جتنا بڑا گناہ ہو۔ میں کارل ساگاں کے اس خیال کا ہوں کہ دو کا پہاڑہ انگریزی میں بھی ہے، عربی میں بھی اور بلوچی میں بھی۔ مگر یہ ''قومی پہاڑہ'' کبھی نہ کہلائے گا۔ نیکی اور روشن خیالی تو ٹرانس نیشنل ہوتی ہیں۔ نجاتِ انسان کے تصورات تو جگ دیسی (cosmopolitan) ہوتے ہیں۔

آیئے ایک سرائیکی شاعر فیض عابد عمیق کی مدد لیں جس نے دیسی، مقامی یا ہم وطن کو اپنی زبان میں ''تل وطنی'' کا نام دے کر یوں کہا:

کیا کجھ ساڈا تل وطنی ہے
ایہہ نروار تاں اوکھا ہے
اچھا سوچو
جیویں دریا تل وطنی ہن
جیویں تھل روہی دیاں کھجیاں

جیویں ساون مانہہ دے بدل

جیویں کونجاں

جیویں بئے بہوں سارے پکھی

بھانویں ایہہ جتھوں وی آون

تل وطنی ہن

جیویں وَن سونے پھل ہن

جیویں خویش قبیلے ذاتاں

وت گن گھنو

اچھا سوچو، نویں لاءتوں

جیویں سُجھ ہے

جیویں چندر ہے

جیویں اگوں آون والے نویں ڈینہہ ہن

جیویں بال ہن

بھانویں ایہہ جتھوں دے ہوون

تل وطنی ہن

بھانویں ول ہک پھیر سوچو

ہر شئے سوہنی تل وطنی ہے

شاہ لطیف نے تو اپنے تجربات ومشاہدات میں پس پس کر انسان کو انسان کے روپ میں دیکھنے کی صلاحیت پیدا کر لی تھی۔ اُس زمانے میں نسلی برتری یا مذہبی تعصب کی ہر کھائی کو پھلاند کر وہ رنگ ونسل، وطن وقوم اور مذہب وعقیدہ کی قیود سے بالاتر ہوا تھا۔ اس نے انسان دوستی کا بلند معیار قائم بھی کیا اور پیش بھی کیا۔.....اور انسان تو بلوچ ہوتا ہے خواہ وہ منڈیلا ہو یا لطیف !!

نسلاً بلوچ ہونا بھی فخر کی بات ہے مگر اصل بات تو خصلتاً بلوچ ہونا ہے، عادتوں میں، رویوں میں، کارناموں میں.....اس لیے کہ بلوچ کے ہاں روایتی طور پر کردار میں بلوچ ہونے پر زور دیا جاتا ہے۔ پیکولین نے ''بلوچ'' نامی اپنی کتاب کا ایک سطر یوں لکھا تھا: ''.....بلوچ جب کسی غیر ملکی سے ملتا ہے تو اشارے سے کہتا ہے: ''آپ بلوچ ہیں ناں؟''۔ اِن جملوں سے اس کا مفہوم یہ ہوتا ہے کہ ''آپ انسان ہیں ناں، بلوچوں کی طرح؟''۔(4)

ہر اچھے انسان کا نسلاً بلوچ ہونا ضروری نہیں ہوتا۔ .....مگر ہر بلوچ کا اچھا انسان ہونا مستحسن ہوتا ہے۔ اور ہر بلوچ کا ہر اچھے انسان کو اچھے بلوچ کا درجہ دینا احسن کام ہے۔..... اور اس میں تو کوئی کلام نہیں کہ شاہ لطیف اٹھنے میں بیٹھنے میں، بولنے میں، گانے میں بلوچ سے بڑا بلوچ ہے۔ بلوچ ہمیشہ اُس کے گڈ بُکس میں ہوتا ہے، وہ ہمیشہ اس کا ذکر کرتا ہے۔ شاہ بلوچ کو آئیڈیل گردانتا ہے۔ اس کی نظر میں بلوچ ہونے کا مطلب ان خوبیوں کا مالک ہونا ہے جو شاہ کے پسندیدہ اوصاف ہیں۔ کسی میں بے شرف اور ذلالت والی زندگی کی بجائے وقار وغیرت کی زندگی گزارنے کی جرات پیدا کرنی ہوگی۔ شخصی وقار اور قومی افتخار کے جذبات پیدا کرنے ہوں گے، کسی طرح کی ترغیب کے خلاف مضبوط ومصمم رہنا ہوگا، اور آزادی اور سچ کی راہ اپنانی ہوگی۔ یہی سب کچھ شاہ نے بلوچ میں دیکھا تھا۔

وہ جا رہا ہے میرا محبوب، میں اس کی راہ میں آگے بڑھوں
کہیں وہ بلوچ مجھے یہ طعنہ نہ دے دے کہ مجھ کم ذات نے کچھ نہ کیا

اور

''میں بلوچ کی محبت میں مکمل گرفتار ہوں

اور

بلوچ کی یاد کو اپنے دل سے نکالنا میرے بس میں نہیں

اور

مجھے محبت کی اہمیت کا اُس وقت احساس ہوا جب میں نے بلوچ سے دوستی کر لی

اور.....

بلوچ کے ساتھ دوستی کا لطف اٹھانا ہمیشہ اچھا ہوتا ہے

اور.....

تمہیں بلوچ کو اُسی طرح دیکھنا ہوگا جس طرح میں دیکھتی ہوں

سو، مان جاؤ شاہ لطیف کی بات اور بلوچ کو اسی طرح دیکھنا شروع کردو جس طرح کہ سسی دیکھتی رہی۔ تمہارا بھی بھلا ہوگا اور بلوچ بھی اچھا خاصا بہتر ہوگا۔

شاہ صاحب ایک جگہ بلوچ سیاسی قیادت کے بارے میں یوں کہتا ہے:

''اُسے خوف و پریشانی نہیں ہونی چاہیے جس کا لیڈر آری جام (بلوچ) ہو''

بلوچ سے تعلق واسطہ شاہ لطیف کو ہمہ وقتی اور کل وقتی مسرت دیتا ہے۔ وہ جب بھی بلوچوں سے رابطہ کرتا اُسے غیر معمولی مسرت ہوتی:

''مجھے ہر درخت اور ہر شاخ سے آری جام کی خوشبو محسوس ہوتی ہے''

اے خدا، بلوچوں کو ہر طرح کی بدقسمتی اور مصیبت سے بچا!

شاہ سسی کی زبانی بیان کرتا ہے کہ اس کے ریشم پیر لہو سے رنگ جاتے ہیں مگر اُسے شکایت نہیں ہوتی اس لیے کہ وہ تو ہوت کی داسی ہے۔ شاہ لطیف صرف ایک بار شکایت کرتا ہے:

بلوچوں سے وفا کا آسرا کیا
خطار کاری ہے اُن سے دل لگانا

مگر یہ شعر کہہ کر وہ فوراً ہی پلٹا کھاتا ہے اور اپنے ہی شعر کی چبھن خود ہی دور کر دیتا ہے:

مجھے معلوم ہے دستور ان کا
نہیں آساں انہیں اپنا بنانا

سسی یادوں، سفر کی مشکلات اور دکھوں کی بپتائیں بیان کرتی جاتی ہے مگر گلہ نہیں کرتی۔ اپنی ذلت وخواری کو بیان کرتی جاتی ہے مگر پھر ایک فقرہ بول کر سب کچھ بھول جاتی ہے کہ میں نے تو ''پیارے پنہوں کو کر دیا بدنام''۔ ایسی اتاہ وابستگی، ایسی بے مثال اپنائیت!! اگلے سسی کی دنیا اجاڑ

کر گئے ہیں۔ اور شاہ سسی کے منہ سے یہ کہلواتا ہے کہ:

جو تجھ پہ کچیوں کا حق تھا واجب
ادا کب اے سسی تو نے کیا ہے

ایسا نہیں ہے کہ سسی کو اپنے پیروں کے چھالے اور دل کے پھپھولے یاد نہیں رہتے۔ ایسا بھی نہیں ہے کہ وہ اپنی مافوق البشر دکھوں تکلیفوں کا ذکر نہیں کرتی۔ مگر وہ جن مصیبتوں تکلیفوں سے گزرتی ہے انہیں بیان کرتے وقت وہ پنوں کے بھائیوں تک سے بھی کوئی گلہ نہیں کرتی۔ اسے اپنی پریشانی نہیں۔ وہ تو ایک جگہ اس ساری کاروائی کو ظلم کہتی ہے، اور وہ بھی اپنے آپ پر نہیں اپنے محبوب پر:

یہ تیرے ہوت کے ہم قوم پر تجھ پر
نہ جانے اور کتنے ظلم ڈھائیں

شاہ کی سسی تو اُن اونٹوں پر بھی قربان ہونے کو تیار ہے جو اونٹ اُس کے محبوب کو لے گئے تھے مگر ہاشم کی سسی اس اونٹ کو دوزخ داخل ہونے کی بددعا دیتی ہے۔ خود بلوچ اُس اونٹ کو لنگڑا ہونے کی بددعا دیتا ہے:

؎ مہر شمئے لنگ باثاں

کوئی کوسنا نہیں۔ کوئی بدگمانی نہیں، کوئی بدکلامی نہیں، کوئی بددعا نہیں۔.....حیرت ہے۔ وہ اپنے محبوب کے اغوا کے باوجود بلوچستان کو باغِ عدن کہتی ہے، منزلِ مہر قرار دیتی ہے، سسی بلوچوں کی خادمہ ہے کہ در دِہستی اُن سے وابستہ ہے۔ وہ بلوچستان کو حسنِ ازل کی جلوہ گاہ کہتی ہے۔

بلوچ کے ساتھ شاہ کی عقیدت وشفقت ازل سے تھی۔ بلوچ تو لطیف کا دل ودماغ اُس دن سے جیت چکا تھا ''جس دن خدا نے یہ دنیا پیدا کی تھی''۔ شاہ لطیف کو ہر شاخ اور ہر درخت سے بلوچ کی خوشبو آتی تھی۔ اس کی ازل سے بے چین آنکھوں میں اُسی لمحہ قرار آیا جب اس نے پنہوں کو دیکھا۔ وہ بلوچوں کے حق میں ہمہ وقت دعا کرتا رہتا ہے۔

شاہ کا بلوچ باوقار زندگی جیتا ہے، شخصی عزت اور قومی وقار اس کے ہیرو کی، اس کے بلوچ

کی نشانیاں ہیں۔سچائی پر کھڑا رہنا ہے ہر طرح کے لالچ اور خوف کے باوجود۔آپ تاریخ اٹھا کر دیکھیں کوئی شاہ لطیف ثانی نہ ملے گا جو مقہور و مظلوم کے منہ سے اپنے محبوب کے اغوائیوں کے حق میں دلائل دلاتا ہو۔ ڈھونڈنے پڑیں گے شاہ کی وہ گہری وابستگی کے اسباب، جو اُسے بلوچوں سے تھی۔

مہر گڑھ و موہن جو دڑو بہت خوش قسمت ہیں کہ اُن کی قدامت کی گود میں محبت کی آزادی کی جدوجہد کرنے والوں کے لیے سنگِ میل کے بطور سسی پنہوں کی مشترکہ قبر موجود ہے۔ اور اُس جدوجہد میں اُن کی راہنمائی کرنے ''شاہ جو رسالو'' نامی لالٹین روشن ہے۔ابد تک۔

حوالہ جات

1-غازی، فضل احمد ہفت روزہ نوکس دور کوئٹہ 13 مئی 1968۔صفحہ 14

2-جی ایم سید۔شاہ لطیف اینڈ ہز میسیج۔صفحہ 65

3-انور احمد، ڈاکٹر۔اداریہ سہ ماہی ''پیلھوں'' ملتان۔جلد نمبر 1۔2013۔صفحہ 5۔
مثال پبلشرز فیصل آباد۔صفحہ

4-پیکولین م ک/ مری، شاہ محمد مری۔بلوچ۔1988۔صفحہ 41

عشاق کے قافلے

جلد نمبر		صفحات	قیمت
1	مزدک (سپارٹیکس، تھامس مور، توماسو کمپنیلا، جیرالڈ ونسٹلے، ، جین ملیر، سینٹ سائمن، اوون، چارلس فیوریئر، پائرے پرودھون ، میخائل باکونن، نکولائی چرنی شیوسکی، ایڈوارڈ ویلنٹ، پیاتر لاورف، نکولائی میخائیلو فسکی، ، جین جاریز، فرڈیناںڈ لاسال، اگسٹ ببیل، ویلہلم لب نخت، وولف۔والٹیر، قراۃ العین طاہرہ)۔	152	300
2	شاہ عنایت شہید	80	150
3	ٹام پین	135	200
4	شاہ لطیف	112	200
5	مست	380	500
6	جینی ویسٹ فالین		
7	کارل لب نخت (روزالگزمبرگ، کلارازیٹکن، فرانز مہرنگ ، ٹرگنیف، ٹالسٹائی، جارجی پلیخانوف)۔	زیرطبع	
8	کروپسکایا	زیرطبع	
9	میکسم گورکی (لونا چرسکی، ٹراٹسکی، جان رِیڈ، انتون گرامچی، جارجی دیمتروف)۔		

10	یوسف عزیز مگسی	200	395
11	عبدالعزیز کرد (نسیم تلوی، محمد امین کھوسہ، ،عبدالرحمان بگٹی، محمد حسین عنقا، قادر بخش نظامانڑیں، خان عبدالصمد اچکزئی، ملک فیض محمد یوسف زئی)۔	152	250
12	ماؤزے تنگ کم ال سنگ۔	112	200
13	ہو چی من (جنرل گیاپ، لی دوان)	120	200
14	فیڈل کاسٹرو (جوزی مارٹی)		
15	چے گویرا (آلندے، شاویز، پبلو نرودا، وکٹر ہارا)۔	زیرطبع	
16	بابو	160	200
17	ملک عبدالرحیم خواجہ خیل (قاضی داد محمد، ،ملک محمد پناہ)	زیرطبع	
18	گل خان نصیر	248	200
19	گل خان کے ساتھی	زیرطبع	
20	سی آر اسلم (فیروز الدین منصور، سید مطلبی فرید آبادی)	سٹاک میں نہیں	

21	کرشن چندر	زیرطبع	
22	بابا بزنجو	150	300
23	خیر بخش مری	زیرطبع	
24	قسور گردیزی (عبدالرحمان کرد، محمد اسلم اچکزئی، ملک محمد پناہ، کرار حسین، لال بخش رند، عبدالرحمٰن غور، زمرد حسین، خلیل صدیقی،، پروفیسر نادر قمبرانی، انور احسن صدیقی، مراد ساحر)	زیرطبع	
25	ماما عبداللہ جان جمالدینی	200	300
26	ڈاکٹر خدائیداد (مراد ساحر ، آزات جمالدینی، نادر قمبرانی، خلیل صدیقی، لال بخش رند، انور احسن صدیقی)	زیرطبع	
27	سائیں کمال خان شیرانی (صوفی نور محمد، صاحبزادہ ادریس، ایتھل اور جولیس روزنبرگ)	160	300
28	سوبھوگیان چندانڑیں (حیدر بخش جتوئی، شاہ لطیف، امام علی نازش، نذیر عباسی، ابراہیم جویو، شیخ ایاز)	200	200
29	پیٹرس لومبا		
30	ڈاکٹر امیر الدین	132	250